www.urducouncil.nic.in

فروری 2023، قیمت :- ₹10

ماهنامه

بچوں کی دنیا

نئی دہلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

بچوں کے قلمکاروں کے لیے سوالنامہ

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' میں بچوں کے قلمکاروں سے انٹرویوز کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے تاکہ بچوں کو قلمکاروں اور کتابوں کے بارے میں معلومات کے ساتھ ساتھ اپنا مستقبل اور کریئر بہتر بنانے کے لیے نئی روشنی اور نئی راہ بھی مل سکے۔ یہ ادارے کی طرف سے تیار کردہ سوالات ہیں، ان کے جوابات ادب اطفال سے جڑا ہوا کوئی بھی قلمکار دے سکتا ہے۔

1 بچپن کی کون سی باتیں/شوخیاں/شرارتیں اب بھی آپ کو بہت یاد آتی ہیں؟
2 بچپن میں آپ کے پسندیدہ مصنّفین کون تھے اور اب کون ہیں؟
3 بچپن میں کس کتاب نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا؟
4 بچپن میں بچوں کے کون سے رسائل آپ پڑھتے تھے؟
5 بچوں کے ذہنی اور فکری ارتقا کے لیے کون سی کتابیں زیادہ مفید ہیں؟
6 زبان و بیان کو بہتر بنانے کے لیے کن مصنّفین کی کتابیں بچوں کے لیے رہنما ثابت ہوسکتی ہیں؟
7 مستقبل اور اپنے کریئر کو سنوارنے کے لیے بچوں کو کن موضوعات اور کتابوں کا مطالعہ کرنا فائدہ مند ثابت ہوگا؟

---

8 اپنے سوانحی اور تعلیمی کوائف کے بارے میں کچھ بتائیں؟
9 آپ کو بچوں کے لیے لکھنے کا خیال کب اور کیسے آیا؟
10 آپ کی پہلی تخلیق، کب اور کس رسالے میں شائع ہوئی؟
11 آپ کے مرکزی موضوعات کیا ہیں؟
12 کتاب لکھنے سے پہلے آپ بچوں کی نفسیات اور ذہنی مطالبات پر ریسرچ کرتے ہیں یا نہیں؟
13 بچوں کے لیے لکھتے ہوئے آپ کو کس طرح کی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟
14 ادیب اطفال کی حیثیت سے ادبی اور علمی حلقے میں آپ کی قدر ہوتی ہے یا نہیں؟
15 کیا آپ اب بھی بچوں کے لیے لکھی گئی کتابیں پڑھتے ہیں؟
16 انگریزی اور دیگر زبانوں میں شائع ہونے والے کون سے رسالے بچوں کے لیے مفید ثابت ہوسکتے ہیں؟
17 کیا اردو میں بچوں کے لیے انگریزی، تیلگو اور دیگر زبانوں جیسا شائع ہونے والا کوئی مکمل رسالہ موجود ہے؟
18 بچوں کے ادب پر جو رسائل شائع ہورہے ہیں، ان کے مواد اور زبان و بیان سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟
19 معاصر ادب اطفال سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟
20 بچوں کے لیے لکھتے ہوئے آج کے دور میں کن موضوعات پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے؟
21 بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے کچھ مفید تجاویز اور مشورے!
22 ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' میں آپ کس نوع کی تبدیلی چاہتے ہیں؟
23 بچوں کے لیے آپ کا کوئی پیغام!

* جوابات کے ساتھ پاسپورٹ سائز تصویر اپنی کتابوں کا عکس ضرور ارسال کریں۔

اس شمارے میں

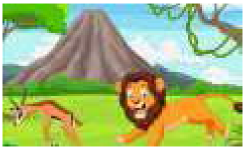

اداریہ	مدیر	04
ڈاک خانہ	قارئین	05
مضامین		
مادری زبان کی اہمیت	یوسف رامپوری	06
درد بے زبانوں کا	ارم نعیم	09
انٹرویو		
ذہنی وفکری ارتقا کے لیے مطالعہ لازمی ہے	اقبال برکی	13
نظمیں		
میرا روبوٹ	شاہد جمیل	19
ایک ٹھٹھری ہوئی نظم	اسد رضا	20
میٹھی بولی	رخشاں ہاشمی	20
طوطا	شمیم انجم وارثی	21
عزم	تبسم سحر	22
چلیں مدرسے	فہیم احمد	23
اسکول کا ترانہ	جاوید رانا	24
پہاڑ	وسیم احمد	25
کام ایسا ماں ہی کر سکتی ہے بس	شکیل حنیف	26
ماں باپ	عذرا خاتون	27
کہانیاں		
نیا کھیل	جہانگیر انس	28
سپنوں کا عکس	انور ادیب	31
پچھتاوا	محمد طارق	34
بہادر بچے	سراج فاروقی	37
چودھری کاکا	عادل حیات	40
ادھورا سبق	سید اسرار الحق سبیلی	43
انسانیت کا درد	غفران حکیم	45
بچوں کے رسائل سے		
ننھے منّے جانوروں کی لائبریری	کے پی سکینہ	47
بچوں کا کتب خانہ		
بچوں کی زمین سے / محمد اسد اللہ	حقانی القاسمی	49
سائنس نامہ		
کینسر: ایک موذی مرض	محمود اختر جلال پوری	51
صحت		
صحت کا خزانہ: گاجر	نشاط اختر	53
زبان شناسی		
وہ الفاظ جن کے حروف میں نامناسب......		56
کہکشاں		
چمن چمن کے پھول		58
ننھے فنکار		
پینٹنگ		59

بچوں کی دنیا

جلد: 11 شمارہ: 02 فروری 2023

مدیر: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم: ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

معاون مدیر: ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارتِ تعلیم، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،

جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000

شعبہ ادارت: 11-49539009

ای میل

bachonkiduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: /10 روپے، سالانہ /100 روپے

▪ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک/ ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت

ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم

نئی دہلی- 110066

فون: 26109746

ای میل: sales@ncpul.in

علاقائی مرکز: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 040-24415194

پیارے بچو! 21 فروری کو 'عالمی یوم مادری زبان' کے طور پر منایا جاتا ہے، مادری زبان اسے کہتے ہیں جسے بچہ اپنی ماں کی گود میں سنتا اور سیکھتا ہے، اور پھر اسے بولنے کی کوشش کرتا ہے، مادری زبان ہماری وراثت ہے اور اس کا تحفظ ہم پر لازم ہے، اس لیے کہ یہی وہ زبان ہے جو نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہے، ہم اپنی مادری زبان میں ہی اپنے جذبات واحساسات کو صحیح طریقے سے بیان کرسکتے ہیں، مادری زبان سے انسان کا جذباتی رشتہ ہوتا ہے، اور اسی زبان میں ہمیں تہذیب واخلاق سکھائے جاتے ہیں، مذہب کی بنیادی باتیں بھی مادری زبان میں ہی بتائی جاتی ہیں، بچے کی تعلیم وتربیت اور ذہنی نشوونما میں بھی مادری زبان اہم کردار ادا کرتی ہے، مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ بچہ ذہنی الجھن اور پریشانی سے بچ جاتا ہے، ماہرین تعلیم کا کہنا ہے کہ بچے کی ابتدائی تعلیم اگر مادری زبان میں ہو تو وہ دوسری زبان بھی بآسانی سیکھ سکتا ہے، ترقی یافتہ ممالک اس بات کا خاص التزام کرتے ہیں کہ بنیادی تعلیم مادری زبان میں ہی ہو۔

عالمی یوم مادری زبان منانے کا مقصد مادری زبانوں کو فروغ دینا ہے، وہ زبان جسے بچپن میں سیکھتے ہیں، بغیر کسی کوشش اور دباؤ کے اس کے الفاظ کو استعمال کرتے ہیں، ہر علاقے، ہر قوم اور ہر ملک کی اپنی زبان ہوتی ہے، انھی زبانوں میں ایک پیاری زبان اردو بھی ہے، یہی ہمارے رابطے کی زبان بھی ہے، اور اسی زبان کو ہم نے اپنے پہلے مکتب یعنی ماں کی گود میں سیکھا ہے، اس لیے اس زبان کی ترویج واشاعت اور اس کے فروغ کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ پیارے بچو! اردو پڑھیں، لکھیں، اس سے محبت کریں اور اسے عام کریں۔ اور اپنی مادری زبان کی ایسے حفاظت کریں جیسے کسی قیمتی اور نادرونایاب چیز کی حفاظت کی جاتی ہے، آپ دوسری زبان بھی شوق سے پڑھیں، اور سائنس، کمپیوٹر، ریاضی اور دوسرے موضوعات کا بھی انتخاب کریں، اس لیے کہ یہ ٹیکنالوجی اور مقابلے کا دور ہے اور آپ کو زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا ہے، ورنہ آپ اس ترقی یافتہ دور میں پیچھے رہ جائیں گے۔ بچو! اردو کا ماضی شاندار رہا ہے، اور اس میں ہمارا تہذیبی، ثقافتی، علمی، ادبی اور سماجی ورثہ محفوظ ہے، اگر ہم نے آج اس زبان کو محفوظ رکھنے کی کوشش نہیں کی تو یہ معلوماتی ذخائر ضائع ہوجائیں گے، اور ہم قیمتی سرمائے سے محروم ہوجائیں گے۔

عالمی یوم مادری زبان کی مناسبت سے ہم نے ایک معلوماتی مضمون 'بچوں کی دنیا' میں شامل کیا ہے۔ آپ ضرور اس کا مطالعہ کریں، آپ کو یہ تحریر پسند آئے گی۔ 'چمن چمن کے پھول' کے تحت معیاری اشعار دیے گئے ہیں۔ آپ انھیں پڑھیں گے تو آپ کو اردو زبان کی خوب صورتی کا بخوبی اندازہ ہوگا۔

آپ کا

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاک خانہ

’بچوں کی دنیا‘ موصول ہونے سے جو مسرت و شادمانی ملتی ہے اس سے کہیں زیادہ تعجب ہوتا ہے کہ فقط 62 صفحات پر مشتمل رسالہ کس قدر موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ زندگی کا کون سا گوشہ ہے جو بچوں کی دنیا میں نہیں ہے۔ سائنس و ٹکنالوجی ہو یا ہمارے قومی رہنما، ادب ہو یا اخلاق، موسم ہو یا فطرت، حب الوطنی ہو یا درس حیات، ماحولیات ہو یا تعلیم۔ گویا یہ رسالہ زندگی کی ہر جہت کو مس کرتا ہے اور طلبا و بچوں کے لیے ایک سمت نما کی حیثیت رکھتا ہے۔

’بچوں کی دنیا‘ جہاں بچوں کے مستقبل کی رہنمائی کرتا ہے، تعلیم کے لیے ایک مہمیز کا کام کرتا ہے، ان کی تربیت کے لیے ممد و معاون بھی ہے نیز بڑوں کے لیے بھی کسی نہ کسی منزل پر کچھ نئی واقفیت سے باور کرتا ہے۔ ہمارے گھر پر بچوں کے علاوہ بڑے افراد بھی نہایت ذوق و شوق سے اس کا مطالعہ کرتے ہیں اور ہر بار کچھ نہ کچھ نئی معلومات ملتی ہیں۔ جنوری کا شمارہ نظم و نثر کے باذوق قارئین کے لیے بھرپور مواد لیے ہوئے ہے۔ نئے سال اور موسمِ سرما کے استقبال میں نظمیں ہیں تو بچوں کی ہری بھری رنگین مصوری بھی رسالے کے حسن و تاثیر میں خوبصورت اضافہ ہے۔

رسالہ ’بچوں کی دنیا‘ کا سرورق ہماری چار اہم شخصیات کو اس طرح سے ظاہر کرتا ہے جس سے اتحاد و اتفاق نیز آزادیِ ہند کی فراہمی کے اسباب پر روشنی پڑتی ہے۔ چار منور تصاویر نہیں بلکہ ایک درس ہے جسے ہم ہندوستانیوں کو اختیار کر کے اپنی زندگی میں نافذ کرنے کی ضرورت ہے جو ایک خوبصورت ملک کی تعمیر و تشکیل کے لیے ہدایت نامہ ہے۔

رسالے اور کتابیں بہتر مستقبل کی ضمانت انھیں کو دیتی ہیں، جنھیں خود خوبصورت زندگی کی طلب ہوتی ہیں، جہاں ماضی کی خوبصورت شخصیات کی تاریخ پڑھ کر حوصلے و پرواز کو قوت ملتی ہے۔ وہیں ان کی خوبصورت تصویروں کے دیدار سے جسم و جان میں ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ رسالہ ’بچوں کی دنیا‘ یہ کام نہایت عمدہ طریقے سے سرانجام دیتا ہے۔ اس لیے مدیر صاحب اور تمام عملہ مبارک باد کا حق دار ہے۔ میری تمنا ہے کہ میرے بچے بھی مستقبل کے چاند ستارے بنیں تاکہ ہمارا ملک روشن و تابناک ہو۔

فردوس بانو فلاحی، گلمرگ اپارٹمنٹس، M-109، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

’بچوں کی دنیا‘ ہر ماہ مطالعے میں رہتا ہے۔ آپ کی کاوشوں کی بدولت رسالہ خوب سے خوب تر کی جانب گامزن ہے۔ میری جانب سے مبارکباد!

زیر نظر جنوری 2023 کے شمارے میں دیگر مشمولات کے علاوہ مولوی محمد حسین آزاد اور مولانا محمد علی جوہر سے متعلق مضامین بچوں کی معلومات میں کافی اضافہ کریں گے۔ اس کے علاوہ سائنسی معلومات سے بھرپور مضامین بھی لائق مطالعہ ہیں۔ نظموں کا حصہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ اس شمارے کی خاص چیز جس نے متاثر کیا وہ ’بات کی باتیں‘ ہیں۔ یہ بچوں کی معلومات میں زبان کے حوالے سے عمدہ اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

مصباح الدین طارق، اردو ماڈل اسکول، نرکٹیا، وایا: بودھ گیا، بہار

یوسف رامپوری

مادری زبان کی اہمیت

وہ زبان جو بچہ اپنی ماں کی گود میں سیکھتا ہے، اسے ’مادری زبان‘ کہا جاتا ہے۔ یعنی اپنی عمر کے ابتدائی دنوں میں بچہ اپنے ماں باپ، بھائی بہنوں، رشتہ داروں اور ارد گرد کے لوگوں کو جو زبان بولتے ہوئے سنتا ہے اور پھر خود بھی بولنے لگتا ہے، اس پر مادری زبان کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ اس عمر میں بچہ کا ذہن بالکل صاف ستھرا اور کورے کاغذ کے مانند ہوتا ہے، وہ دنیا کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا ہے، چند لوگ اس کے پاس ہوتے ہیں، ماں باپ، دادا دادی، بھائی بہن وغیرہ۔ وہ انھیں بار بار دیکھتا ہے، بار باران کے چہروں کی شناخت کرتا ہے، بار باران کی آوازیں سنتا ہے، اس طرح ان کے چہرے بھی اس کے ذہن میں سما جاتے ہیں اور آوازیں بھی۔ پھر ان کے بولنے کا لہجہ بھی قدرتی طور پر اس کے ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ کچھ اور مہینے گزرنے کے بعد وہ اپنے والدین، دادا دادی اور بھائی بہن وغیرہ کے ذریعے بار بار بولے جانے والے الفاظ کو بھی پکڑنے لگتا ہے۔ جیسا ابّا، ابّو، امّاں، امّی، دادا، دادی، دودھ وغیرہ۔ بہت چھوٹا ہونے کی وجہ سے اس کی زبان پوری طرح سے لفظوں کو ادا نہیں کر پاتی، اس لیے آدھے ادھورے لفظ ہی اس کی زبان سے ادا ہوتے ہیں، مگر ان آدھے ادھورے لفظوں کی بنیاد اس کے ماں باپ کے ذریعے بولے جانے والے پورے لفظوں پر ہوتی ہے۔ اب ماں باپ اسے لفظ سکھانے لگتے ہیں، کیونکہ وہ سمجھ جاتے ہیں کہ وہ سیکھنے کی عمر میں آ گیا ہے اور لفظوں کو پکڑنے لگا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہت سے الفاظ بنا سکھائے ہی بچہ خود سن کر سیکھ جاتا ہے، یا یوں کہیے کہ اس کے دماغ میں وہ الفاظ بیٹھ جاتے ہیں، جو اس کے ماں باپ، بھائی بہن یا گھر کے دوسرے افراد بولتے ہیں۔ لفظوں کے بعد باری آتی ہے، جملے بولنے کی۔ شروع میں بچہ بالکل چھوٹے چھوٹے جملے سن کر بولنا سیکھتا ہے۔ جیسے دے دے، آ جا، دودھ دے دے وغیرہ۔ چھوٹے جملوں کے بعد پھر تھوڑے بڑے جملے بھی اس کے دماغ میں بیٹھنے لگتے ہیں، لیکن یہ جملے بھی وہی ہوتے ہیں جو اس کے ماں باپ، بھائی بہن، دادا دادی اور گھر کے دوسرے افراد بولتے ہیں۔ اس طرح گھر کے ماحول میں بولی جانے والی زبان وہ سیکھ لیتا ہے، اور بول لیتا ہے۔ الفاظ، الفاظ کی ادائیگی، جملے، جملوں کی ساخت، لہجہ اور انداز سب کچھ وہی ہوتا ہے جو وہ اس

چھوٹی سی عمر میں سنتا اور سیکھتا ہے۔یہی مادری زبان ہوتی ہے۔ایک ایسی زبان جس کے ذریعے وہ اپنے مافی الضمیر کو پوری طرح ادا کرنے پر قادر ہوجاتا ہے۔اسے اپنی بات کہنے کے لیے کسی دوسری زبان کے لفظوں کی بھی ضرورت نہیں پڑتی اور نہ ہی جملوں کی۔

عمر کے ابتدائی دنوں میں ماں باپ اور گھر کے دیگر افراد کے ذریعے بولی جانے والی زبان ہر شخص کا وہ اثاثہ ہوتی ہے جس پر وہ فخر بھی کرسکتا ہے اور جس کا کوئی بدل بھی نہیں ہوتا۔ بڑے ہوکر بچے کو دوسری زبانیں بھی سکھائی جاتی ہیں، جیسے انگریزی، عربی، فارسی وغیرہ،لیکن حقیقت یہ ہے کہ سالہا سال ان زبانوں کو سیکھنے اور پڑھنے کے باوجود وہ اپنے مافی الضمیر کو اس طرح بولنے پر قادر نہیں ہوتا جتنا کہ مادری زبان میں ہوتا ہے جسے اس نے اپنی عمر کے ابتدائی سالوں میں سیکھا تھا،اور وہ بھی بغیر کسی کتاب، استاد،اسکول وغیرہ کی مدد کے۔ مادری زبان کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں بولنا ہر شخص کے لیے آسان بھی ہوتا ہے اور اس زبان میں دوسروں کی بات سمجھنا بھی آسان ہوتا ہے۔ اسی لیے آج ماہرین لسانیات اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انسانی زندگی میں جن علوم وفنون کو سیکھنے کی ضرورت ہے، انھیں مادری زبان میں پڑھایا جانا چاہیے تاکہ طلبا آسانی سے انھیں سمجھ اور سیکھ سکیں۔لیکن یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ گزشتہ کچھ سالوں سے مختلف موضوعات ومضامین کو انگریزی زبان میں پڑھانے اور سکھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بے شمار بچے کتابیں تو پڑھ لیتے ہیں، وقتی طور پر کچھ نہ کچھ یاد بھی کرلیتے ہیں اور امتحان میں کسی طرح پاس بھی ہوجاتے ہیں لیکن ان موضوعات ومضامین پر انھیں پورا عبور حاصل نہیں ہوپاتا۔لیکن اگر ان مضامین کو ان کی اپنی زبان میں پڑھایا جاتا تو وہ انھیں زیادہ سمجھتے اور کمال بھی حاصل کرتے۔یہی وجہ ہے کہ حکومت ہند نے اپنی تعلیمی پالیسی میں مادری زبان کو خاصی اہمیت دی ہے۔

'مادری زبان' ہر شخص کے لیے اہم ہے۔اس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔جس طرح اپنے آبا واجداد کی وراثت کو سنبھال کر رکھا جاتا ہے،اسی طرح مادری زبان کو بھی سنبھال کر رکھنا چاہیے،یعنی اس کے تحفظ وفروغ کی کوشش کرنی چاہیے۔ اسے برباد کرنا گویا نہایت قیمتی شے کو برباد کرنا ہے۔ مادری زبان کے علاوہ بعض دوسری زبانیں سیکھنا بھی وقت کا تقاضہ ہے۔مثال کے طور پر قومی زبان ہر شخص کو آنی چاہیے،جس میں سرکاری کام کاج کیے جاتے ہیں اور جو پورے ملک میں سمجھی اور بولی جاتی ہے۔تاکہ زبان کی سطح پر کسی بھی کام کے کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔اسی طرح کوئی ایک زبان ایسی بھی سیکھی جاسکتی ہے جو بین الاقوامی سطح پر بولی،سمجھی اور پڑھی جاتی ہو۔جیسا کہ اس زمانے میں انگریزی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ہر ملک میں اس کا رواج ہے۔لیکن ان زبانوں کے ساتھ اپنی مادری زبان کو ضرور سنبھالے رہنا چاہیے۔بعض لوگ انگریزی یا دوسری زبانوں سے اس قدر مرعوب ہوجاتے ہیں کہ وہ اپنی مادری زبان کی طرف توجہ نہیں دیتے،اور دوسری ہی زبانیں بولنے کو ترجیح دیتے ہیں،جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مادری زبان کے بہت سے الفاظ و جملے ان کے ذہن سے محو ہونے لگتے ہیں۔اس طرح ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ مکمل طور پر اپنی مادری زبان روانی اور شستگی کے ساتھ بولنے پر قادر نہیں رہتے، اور دوسری زبانوں پر بھی انھیں مکمل عبور حاصل نہیں ہوتا، اس صورت میں ان کے پاس کوئی ایسی زبان نہیں ہوتی جس میں وہ مکمل طور پر اپنی بات کہہ سکیں۔

ماں باپ کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کو اپنی زبان سکھائیں، وہ زبان جو وہ خود بولتے ہیں، جو ان کے گھر میں بولی جاتی ہے

اور جوان کے آباواجداد بولتے تھے، اس طرح جہاں بہت سی زبانیں محفوظ رہیں گی، وہیں بچوں کو ایک ایسی زبان آجائے گی جس میں وہ اپنی ہر بات کو بلاکسی تکلف کے پیش کرسکتے ہیں، لیکن تشویش کی بات یہ ہے کہ آج کل بہت سے ماں باپ اپنے بچوں کی مادری زبان میں ملاوٹ کررہے ہیں اور دوسری زبانوں کے الفاظ زبردستی اس میں داخل کررہے ہیں۔ جیسا کہ امّاں، امّی، ماں کی جگہ مدر، موم، ابّا، ابّو، بابا کی جگہ ڈیڈی، پاپا، چچا، خالو، ماموں کی جگہ انکل، 'دودھ' کی جگہ 'مِلک'، 'مکھن' کی جگہ 'بٹر'، وغیرہ۔ حدتو یہ ہے کہ اپنے بچوں سے بولتے وقت جملوں کے اندر انگریزی الفاظ کو درمیان میں داخل کرکے ان کی زبان کو بگاڑ رہے ہیں۔ جیسے: 'بیٹا ہینڈ پکڑلو' یا 'فنگر پکڑلو'، مِلک پیوگے؟ اٹھ جاؤ، مورننگ ہوگئی۔ کیا اس زبان کو خوبصورت زبان کہا جاسکتا ہے؟ ہرگز نہیں! کیا اس طرح کے الفاظ استعمال کرکے بچوں کے جملوں کو خراب نہیں کیا جارہا ہے؟ آخر اس سے کیا حاصل ہوگا؟ کیا وہ اس طرح انگریزی کے ماہر بن جائیں گے؟ اگر بن بھی گئے تو کیا ان کی مادری زبان باقی رہ پائے گی؟ سوچنے کا مقام ہے! آج بہت سی زبانیں اور بولیاں ختم ہورہی ہیں، کتنی ختم ہوچکی ہیں۔ اگر ہمارا یہی رویہ آگے بھی جاری رہا تو بہت جلد اور بھی بہت سی بولیاں اور زبانیں دنیا سے ختم ہوجائیں گے، جسے کسی بڑے خسارے سے کم نہیں کہا جاسکتا۔

بچے کی وہ عمر جو مادری زبان سیکھنے کی ہوتی ہے، اس میں دوسری زبانوں کی آمیزش نہیں کی جانی چاہیے۔ پوری طرح مادری زبان پر ہی توجہ کو مرکوز رکھنا چاہیے، تاکہ ابتدائی چند سالوں میں وہ اپنی مادری زبان پر قادر ہوجائے۔ اس کے بعد دوسری زبانیں سکھائی جاسکتی ہیں۔ جس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اس کی مادری زبان بھی دوسری زبانوں سے زیادہ متاثر نہیں ہوگی اور یہ مادری زبان دوسری زبانوں کے سیکھنے کے لیے معاون بن جائے گی۔ شاید ماہرین لسانیات کو اس بات سے اختلاف نہ ہو کہ ایک زبان دوسری زبان کے سیکھنے کے لیے مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اسی لیے دیکھا جاتا ہے کہ وہ لوگ جو مختلف زبانوں کے سیکھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں، وہ ایک زبان کی مدد سے دوسری زبان جلدی اور آسانی سے سیکھ لیتے ہیں۔ اس طرح بعض لوگ تو چار چار پانچ پانچ زبانیں سیکھ لیتے ہیں۔ لیکن وہ شخص جسے کوئی مکمل زبان نہیں آتی، اس کے لیے دوسری زبانوں کا سیکھنا بھی آسان نہیں ہوتا۔

ہندوستان میں بہت سے علاقے، خاندان اور ماں باپ ایسے ہیں جن کی مادری زبان 'اردو' ہے۔ لہٰذا مادری زبان کی اہمیت و وقعت کا تقاضہ ہے کہ اردو والے بھی اپنے بچوں کو ان کی ابتدائی عمر میں اردو سکھائیں اور کسی طرح کے احساس کمتری کے شکار نہ ہوں۔ اردو ایک مکمل زبان ہے، جسے ملک وبیرون ملک کے کروڑوں لوگ جانتے ہیں۔ جس میں مختلف علوم وفنون کی کتابیں موجود ہیں، بہت سے اردو والے اچھی انگریزی بھی جانتے ہیں، اور اچھی ہندی بھی، اس کے علاوہ دیگر زبانیں بھی اور بہت سے اردو والے مختلف علوم وفنون میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ گویا کہ اردو کسی کو آگے بڑھنے سے نہیں روکتی بلکہ آگے بڑھنے کی راہ ہموار کرتی ہے۔ اس لیے ابتدائی عمر میں مادری زبان کے طور پر اردو والوں کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کو اردو سے محروم نہ رکھیں۔ اس طرح نہ صرف اردو زبان کا فروغ ہوگا بلکہ آگے چل کر اردو ان کے بچوں کی شخصیت کو سنوارنے اور ان کے مستقبل کو تابناک بنانے میں بھی معاون ثابت ہوگی۔

■

Yusuf Rampuri
Mohalla Tandola, Tanda
Distt Rampur- 244925 (UP)
Mob: 9310063594

ارم نعیم

درد بے زبانوں کا

پیارے بچو! آج میں آپ سے بہت اہم موضوع پر گفتگو کروں گی، آپ کو یاد ہوگا کہ ہم سب اپنے بچپن میں جب کسی بات پر رونا شروع کرتے تھے تو ہمارے بڑے اس وقت کسی چڑیا، کتا، بلی، بکری، گائے جیسے چرند پرند دکھا کر ہمیں بہلاتے تھے اور ہم بچے انہیں دیکھتے ہی خاموش ہو جاتے۔ دورِ حاضر کے فلیٹ نما گھروں میں صحن کا تصور ہی نہیں رہا، اس لیے پیڑ بھی گملوں میں محدود رہ گئے، جبکہ پہلے آنگن میں بڑے بڑے پیڑ لگائے جاتے، جن میں بیشتر پر چڑیا، کبوتر، فاختے اپنا گھونسلے بناتے اور ان میں اکثر ننھی زندگیاں پلتی نظر آجاتیں، تب ہمیں دادی نانی خوب ساری اخلاق آموز باتیں سکھایا کرتیں کہ کس طرح ان کے کھانے پینے کا خیال رکھا جائے کہ انھیں کسی قسم کی تکلیف و آزار نہ پہنچے، اسی طرح عیدالضحیٰ کے موقع پر گھر آئے جانوروں سے محبت کا درس دیا جاتا، تاکہ اللہ کے حضور ہماری قربانیاں قبول ہوں۔

جب ہم بڑے ہوئے اور اسکول جانے لگے تو انگریزی کی کتابوں میں Z for Zoo کے ساتھ Z for Zebra بھی پڑھایا گیا، جہاں شیر، ہاتھی، چیتا، ژراف جیسے جانے کتنے جانور، پرندے، لوہے کے پنجروں کے اس پار نظر آتے، بچپن میں یہ چیزیں دل کو خوب محظوظ کرتیں، ایک دفعہ میرے ماموں مع گھر والوں کے لکھنؤ و دلّی کے چڑیا گھر گھوم کر آئے۔ ان کی تصویریں دیکھ کر ہم نے بھی جانے کی ضد کی مگر کبھی وہاں جانے کا اتفاق نہ ہوا، دن گزرتے گئے اور ہم اسکول سے یونیورسٹی آگئے، جہاں کے تعلیمی نظام نے ہماری سوچ، فکر، عقل وشعور کو بہت حد تک متاثر کیا، اب چیزوں کو دیکھنے کا زاویہ بدل گیا اور انہی باتوں میں چڑیا گھروں کی کڑوی حقیقت بھی ہم پہ عیاں ہونا شروع ہوگئی کہ بظاہر دل بہلانے والے اس مقام کی اصل حقیقت کیا ہے؟ ان پنجروں کے باطن میں کس قدر بے بسی، درد وکرب اور رنج و تکلیف پوشیدہ ہے لیکن باوجود اس سب کے یہاں سیر وتفریح کرنے والے تماش بینوں کو ان باتوں کا کوئی احساس نہیں۔

ان جانوروں کو دور دراز کے صحراؤں سے لاکر یہاں قید کرلیا جاتا ہے اور نشیلی ادویات کے ذریعہ بیہوش رکھا جاتا ہے کہ یہ حملہ آور نہ ہوں، پھر جستہ جستہ کچھ Trainers انھیں Train کرنے کے لیے کبھی مارتے، کبھی Electric Shock دیتے ہیں تاکہ ان کے حرکت وعمل سے Visitors کی تعداد اور آمدنی دونوں میں اضافہ ہو، اور حد تو تب ہوتی ہے جب انھیں قابو میں رکھنے کے لیے ان کی مقررہ خوراک سے بھی کم کھانا دیا جاتا ہے جس سے ان کی طاقت وقوت مسلسل گھٹتی جانے کے صورت میں یہ کسی کو نقصان نہ پہنچا سکیں۔ تو حضورِ والا! سوال یہ ہے کہ جب ہمیں ان کی موجودگی سے ایسے خطرات کا اندیشہ ہے تو کیا یہ فرض ہے کہ ہم اپنے نفس کی تسکین کے لیے ہر وہ کام کریں جس کے لیے وہ ہمیں آمادہ کرے، اور جن خواہشوں کی ابتدا تو ہے مگر انتہا کوئی نہیں۔ تبھی تو غالب کو کہنا پڑا کہ

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ان جانوروں کو دیکھنے کے لیے ہم اتنے خودغرض ہوگئے کہ اوّل تو انھیں قید کرکے تکلیف دیتے ہیں اور ان کے حملوں سے خود کو بچانے کے لیے درد کا حقدار بھی انھیں ہی بناتے ہیں، کیا اللہ نے اسی دن کے لیے ہمیں اشرف المخلوقات کا درجہ دیا کہ ہم اسی کی دنیا میں اس کی بے زبان مخلوقات کے ساتھ یہ ناروا سلوک روا رکھیں؟ ان رویوں کو دیکھنے کے بعد ہم میں اور حیوانوں میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟ کیا اسی دن کے لیے ہمیں جسم و جان کے ساتھ زبان، دل اور عقل وشعور سے نوازا گیا کہ اس کا استعمال بس اپنے فائدے کے لیے کریں؟ آج انسان کس قدر کاروباری، خودغرض، مصنوعی اور مطلب پرست ہوتے جارہا ہے کہ اسے دوسروں کے درد سے تب تک سروکار نہیں جب تک اس میں کوئی اپنا شامل نہ ہو، ارے ہم تو اس ملک کے باشندے ہیں جہاں گائے کو ماں کا درجہ دیا جاتا ہے، چڑیوں کو مسکن دینے کے لیے گھروں میں پیڑ لگائے جاتے ہیں، جہاں گرمیوں کی آمد ہوتے ہی چھتوں ومنڈیروں پر دانے پانی کا برتن رکھا جاتا ہے تاکہ پرندوں کو لو اور دھوپ میں خوار نہ ہونا پڑے، جہاں جاڑے برسات میں پالتو جانوروں کے چوپال کا انتظام کیا جاتا تاکہ انھیں کوئی تکلیف نہ پہنچے، مگر آج ہم موبائل، ٹی وی اور کمپیوٹر کے سبب گھر کے بڑے بزرگوں کی تربیت سے محروم ہوتے جارہے ہیں۔ اول تو اسکول، ٹیوشن اور پھر سوشل میڈیا کے بعد بچوں سے پاس مہلت ہی نہیں ہوتی، اور اگر بڑے کوئی نصیحت کریں بھی تو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتے ہیں، اسی وجہ سے اب سڑکوں پر یہ نظارہ عام ہے کہ بچے محلوں میں اینٹ، پتھر، ڈنڈے یا پٹاخوں سے لوگوں کو تکلیف پہنچا رہے ہوتے ہیں، کبھی کوئی مسافر انھیں ٹوک دیتا ہے تو کبھی وہ بھی اس سب سے لطف اندوز ہونے لگتے ہیں پھر ان بچوں کی ہمت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے اور رہتی زندگی اس کام کو ایک شغل کی مانند کرتے جاتے ہیں کیونکہ ان کی بدعملیوں پر انھیں گھر سے اسکول تک کبھی سزا دے کر کوئی سبق نہیں سکھایا جاتا۔ ظاہر ہے جب ہمیں اپنی روایات، تہذیب وثقافت اور قدروں کا علم ہی نہ ہوگا تو ہمارے مزاج میں اخلاقیت کیوں کر شامل ہوگی؟

ہمیں حضرت عمر فاروقؓ کا وہ قصہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے جب ان کی خلافت کے زمانے میں سیلاب آیا اور بادشاہِ مصر نے سے انھوں نے خط کے ذریعے وہاں کا حال دریافت کیا تو بادشاہ نے لکھا کہ ''کسی جان اور مال کا نقصان نہیں ہوا، سب محفوظ ہیں، ہاں! مگر ایک کتا سیلاب کی زد میں آگیا'' بس اتنا لکھنا تھا کہ دھاڑیں مار کر رونے لگے، لوگوں نے پوچھا ایک کتے کی موت پر اس قدر کیوں روتے ہیں؟ تو

کہا ”کل اللہ بروزِ محشر مجھ سے سوال کرے گا کہ عمر تیری حکمرانی میں میری ایک بے زبان مخلوق کیونکر ہلاک ہوئی، تُو اس کے ساتھ انصاف نہ کرسکا، اس کی خبر نہ لے سکا، تو عمر اللہ کو کیا جواب دے گا۔“

تو پیارے بچو! یہ ہے انصاف پسندی، یہ ہے عدل پرستی کہ ایک 22 لاکھ مربع میل کا حاکم ایک بے زبان مخلوق کی جان جانے پر اس طرح رو رہا ہے جیسے کوئی اپنے عزیز کے بچھڑنے پر روتا ہے، ہر چند کہ اسے علم ہے کہ وہ ایک وقت میں ہر جگہ موجود نہیں ہو سکتا، باوجود اس کے اس میں ہر ایک ادنیٰ و اعلیٰ تک مدد پہنچانے کا، صورتِ حال کو بہتر و برتر کرنے کا جذبہ تو ہے، میرے دوستو! یہ مزاج، یہ صداقت، یہ احساس تب پیدا ہوتا ہے جب آپ میں اپنے رب کا خوف ہو، اپنے مقاصد سے عشق ہو تو ایسے وقت میں کوئی بھی مشکل ہمیں منزل تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی، یاد رکھیے کوئی بھی شے بنا کوشش کے حاصل نہیں ہوتی۔ آپ خود سوچیے کہ یہ کہاں کی انسانیت ہوئی کہ ہمیں مرغی سے انڈے، گائے بھینسوں سے دودھ، بکری سے گوشت میسر ہوتا ہے تو ہم ان کی حفاظت کریں، لیکن ان کے علاوہ جن جانوروں سے ایسے فیض نہ ملیں تو ہم ان سے کوئی سروکار نہ رکھیں، ہمیں اچھی طرح ذہن نشین ہونا چاہیے کہ اللہ نے ہمیں حیوانِ ناطق بنانے کے ساتھ ہم میں سوچنے، سمجھنے، احساس و فکر کرنے کا مادہ دوسروں سے حد درجہ زیادہ عطا کیا ہے اور سب کو ایک محبت کرنے والے دل سے نوازا تا کہ اس میں ہم فقط اپنے مفاد کی باتیں نہ سموئیں بلکہ اس رب کی دوسری مخلوقات کی بھی فکر کریں۔

ذرا سوچیے جب ہم گھر میں کوئی پالتو جانور رکھتے ہیں وہ گائے، بکری، کتا یا پرندہ کوئی بھی ہو ہم ان ماں اور بچوں میں لمحوں کی بھی جدائی برداشت نہیں کرتے تو کیا ان جنگل سے آئے بے زبانوں کا کوئی خاندان نہ ہوگا؟ کیا انھیں آزادی سے جینے کا حق نہیں؟ ہم اُس ملک کے باشندے ہیں جو ایک عرصے تک انگریزوں کی قید و بند میں تھے

ذاتِ باری تعالیٰ تو یوں بھی اپنے بندوں پر رحمت برسانے کو تیار ہے لیکن ہم میں کچھ کر گزرنے کا عزم اور ہمت بھی تو ہو، اس رب سے یقین و بھروسے کے ساتھ کچھ مانگنے کا حوصلہ بھی تو ہو پھر تو رحمتیں یوں برستی ہیں کہ آتشِ نمرود کو حکم ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ کو نہ جلانا تو وہ گل و گلزار ہوجاتی ہے، دریائے نیل کو ندا آتی ہے کہ قومِ موسیٰؑ کو نہ ڈبونا تو وہ اپنی گہرائی چاک کرکے راستہ دے دیتی ہے، چھری کو حکم ملتا ہے کہ اسمٰعیلؑ کی گردن پر اثر نہ دکھانا تو وہ وہیں ٹھہر جاتی ہے، مچھلی کو حکم ہوتا ہے کہ یونسؑ کو نگلنے کے باوجود پیٹ میں زندہ رکھنا تو وہ زندہ و سالم باہر نکال دیے جاتے ہیں، یہ ہے خالقِ کائنات پر اعتماد و بھروسہ رکھنے والوں کا انعام اور مقام۔ تو کیا ہمارے وقت پر وہ مالک ہمیں اپنی رحمتوں سے مالا مال نہیں کرے گا، لیکن ہم دنیا کی آسائشوں و آرام میں اس قدر مبتلا ہیں کہ باقی باتوں کا تصور ہی نہیں کرتے۔

پیارے بچو! آیئے ایک دفعہ اس رب کی رضا، خوشنودی اور اس کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے لیے ان بے زبانوں کے تحفظ کا عزم کریں، چڑیا گھروں کا بائکاٹ کرتے ہوئے ان کے ٹکٹوں کی خرید و فرخت سے خود کو روکیں اور

دوسروں کو بھی سمجھائیں، بظاہر ہماری یہ چھوٹی سی پہل بھی ان کی آمدنی پر اثر انداز ہوگی اور کیا پتہ حکمرانِ ہند بھی اس جانب متوجہ ہو کر ان چڑیا گھروں پر پابندی عائد کرنے کے ساتھ انھیں دشت و بیاباں جو ان کا اصل گھر و مسکن ہے وہاں بھیجنے کا حکم صادر کریں اور یہ اس قید و بند سے نجات حاصل پاسکیں۔

ذرا سوچیے جب ہم گھر میں کوئی پالتو جانور رکھتے ہیں وہ بکری، کتا یا پرندہ کوئی بھی ہو ہم ان ماں اور بچوں میں لمحوں کی بھی جدائی برداشت نہیں کرتے تو کیا ان جنگل سے آئے بے زبانوں کا کوئی خاندان نہ ہوگا؟ کیا انھیں آزادی سے جینے کا حق نہیں؟ ہم اُس ملک کے باشندے ہیں جو ایک عرصے تک انگریزوں کی قید و بند میں تھے، ہم تو آزادی کی اہمیت وافادیت اور اس کے معنی ومفہوم سے بخوبی واقف ہیں، اس لیے ہمیں ان کا درد و تکلیف سمجھنے کی بھی اشد ضرورت ہے۔ Zoo کے برعکس Natioonal Parks, Animal Sanctuary, Bird Sanctuary وغیرہ کو بڑھاوا دینا چاہیے جہاں کبھی کبھار جا کر محفوظ گاڑیوں کی مدد سے قدرت کے ان بے مثال نظاروں سے محظوظ ہوا جا سکے، جس سے نہ تو ہمیں کوئی تکلیف ہو اور نہ ہی ان بے زبانوں کو۔ کم از کم ان جگہوں پر انھیں یہ سہولت تو میسر ہوگی کہ یہ آزادی سے ادھر اُدھر گھوم سکتے ہیں شکار کے ذریعے اپنی متعین غذا سے اپنا پیٹ بھر سکتے ہیں وہاں نہ تو انھیں کمزور بنانے کے لیے کم کھانا دیا جائے گا اور نہ ہی Training کے نام پر Electric Shock یا نشے کے انجکشن دیے جائیں گے۔

آپ کو اپنے بچپن کا ایک واقعہ سناتی ہوں، جنوری کی اس شام ٹھنڈ اپنے عروج پر تھی گھر کے سامنے کتیا نے بچے دیے تھے، کبھی کبھار صفائی والے وہاں پڑا کچرا جلاتے تو ان ماں بچوں کو بھی کچھ گرماہٹ مل جاتی، اس شام ایک بچہ اس سے منسلک نالی میں گر گیا، وہ لگاتار روتا رہا اور ماں اس کی آواز سن کر بے چین ہوتی رہی کہ کس طرح اس کی جان بچائے مگر وہ بچے کو اٹھا کر اوپر تک لانے سے قاصر تھی، ہار کر وہ بھی روتے ہوئے ایک ایک کو مدد طلب نظروں سے تکنے لگی مگر کوئی آگے نہ آیا اتفاق سے ایک بنجارے (جو کچرا بیچ کر پیٹ بھرتے ہیں) کا گزر ہوا اس نے بچے کی آواز سنتے ہی کاندھے پر لٹکی بوری اتاری اور نالی میں ہاتھ ڈال کر اس روتے تڑپتے پلّے کو پل بھر میں باہر نکال کر وہیں پڑے کسی کپڑے سے اس کے گیلے جسم کو پوچھنے لگا، کتیا اس کے ارد گرد گھوم کر اسے شکر آمیز نظروں سے تکنے لگی، اب کچھ لوگ رُک کر یہ سب دیکھنے لگے تو وہ بنجارا بس اتنا بولا کہ ”اس کی بھی جان ہے اس کو بھی درد ہوتا ہے“ اور تب تک بچہ ماں کی آغوش پا کر چپ ہو گیا، اس منظر کو دیکھنے کے بعد ہم نے بھی مصیبت زدہ جانوروں کی مدد کرنی شروع کر دی۔ پیارے بچو! آپ بھی ایسا کریں، کبھی اپنی پاکٹ منی یا سیونگس سے ان کے لیے چند بسکٹ خرید کر انھیں کھلائیں یقین مانیں آپ کو خود چاکلیٹ کھانے سے زیادہ تسکین ملے گی۔

میں آپ کو اور بھی واقعات سنا سکتی تھی مگر فقط ایک قصے پر اکتفا کیا تاکہ آپ سبھی اپنے بچپن سے جڑے ایسے قصوں کو یاد کریں اور اگر آپ نے کبھی بھی ایسا کوئی کام کر رکھا ہے تو اسے دوبارہ سے آگے بڑھائیں اور نہیں کیا تو اب سے شروع کریں کیونکہ ہر دن آفتاب ایک نئی صبح نئی امیدیں لے کر نمودار ہوتا ہے اور پھر اچھی باتوں کی نیک کاموں کی ابتدا تو کبھی بھی کی جاسکتی ہے۔

■

Eram Naim
Asst. Prof. Govt Raza PG College
Rampur-244901 (UP)
Mob.:7985705617

ذہنی و فکری ارتقا کے لیے مطالعہ لازمی ہے

اقبال برکی

س: بچپن کی کون سی باتیں / شوخیاں/ شرارتیں اب بھی آپ کو بہت یاد آتی ہیں؟

ج: ہمارے محلے کی مسجد میں ایک شبینہ مدرسہ چلتا تھا۔ مدرسہ بھی مسجد کی عمارت کا حصہ تھا۔ مسجد سے متصل شمالی سمت میں ایک بڑا سا کمرہ تھا جس کی چاروں دیواروں میں سے تین دیواروں میں پرانے طرز کے خوب بڑے بڑے طاق بنے ہوئے تھے۔ ان کے اوپر دیوار کی چوڑائی کے برابر پلاٹ لگے ہوئے تھے۔ ان طاقوں میں اور پلاٹوں پر قرآن شریف کے نسخے خوب قرینے سے رکھے ہوتے تھے۔ یہی کمرہ مدرسہ کہلاتا تھا۔ مدرسے میں داخلے کے دو دروازے تھے۔ ایک دروازہ مسجد کے اندر سے کھلتا تھا، دوسرا مشرقی دیوار میں سامنے صحن سے اندر آنے جانے کے لیے تھا۔ صحن بھی خوب لمبا چوڑا تھا اور مدرسے کا ہی حصہ تھا۔ مغرب کی نماز کے بعد امام صاحب ہمیں ناظرہ قرآن کریم پڑھاتے تھے۔ مسجد کے اندر سے آ کر جو دروازہ مدرسے میں کھلتا تھا وہ مشرقی دیوار کے بالکل قریب تھا۔ مسجد کے ہال سے ایک پائیدان اُتر کر مدرسہ میں آیا جا سکتا تھا۔ پائیدان کے بازو سے مشرقی اور جنوبی دیوار کا کونا بنتا تھا۔ اسی کونے میں امام صاحب اپنے جوتے رکھا کرتے تھے۔ ان کی نشست گاہ مسجد والے دروازے کے عین سامنے شمالی دیوار سے لگ کر تھی۔ یہاں سے وہ دونوں دروازوں سے گزرنے والوں پر نظر رکھ سکتے تھے۔

مغرب کی نماز کے بعد طلبہ مدرسے آنے لگتے۔ وہ جیسے جیسے مدرسے میں داخل ہوتے حافظ صاحب کے قریب دیوار سے لگ کر بیٹھتے چلے جاتے۔ اس طرح چاروں طرف کی دیوار سے لگ کر ہم بیٹھ جاتے۔ مجھے کئی بار اندرونی دروازے کی پائیدان کے قریب جگہ ملی۔ میں وہیں بیٹھ کر سبق یاد کرتا اور جا کر سنا دیتا تھا۔ میں دیکھا کرتا تھا کہ حافظ صاحب کے جوتوں کے قریب سے کالی چینٹیوں کی قطار ایک طرف سے آتی اور دوسری طرف سے جاتی ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ دماغ میں کیڑا کلبلایا۔ ایک شام گھر سے نکلتے ہوئے گڑ کا ایک دھیلہ جیب میں رکھ لیا اور مدرسے میں اسی کونے کے قریب جا بیٹھا۔ حافظ صاحب کے جوتے قریب ہی تھے۔ جب مدرسے میں حاضر تمام طلبہ اپنا اپنا سبق یاد کرنے اور امام صاحب ایک ایک کا سننے لگے تو دوسروں کی نظر بچا کر گڑ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کیے اور دونوں جوتوں میں ڈال دیے۔ اس کے بعد پوری توجہ اور انہماک سے اپنا سبق یاد

اقبال برکی کی کتابوں کا عکس

کرنے میں لگ گیا۔سبق سنانے کے بعد فکر لاحق ہوئی کہ کب چھٹی ہوتی ہے اور کب شرارت کا انجام دیکھتے ہیں۔ بالآخر کچھ دیر بعد چھٹی ہوگئی۔ میں اپنے چند ساتھیوں کو لے کر تیزی سے باہر نکلا اور ایسی جگہ جا کھڑا ہوا جہاں سے حافظ صاحب ہمیں نہ دیکھ سکیں لیکن ہم انھیں دیکھ سکیں۔ میرے ساتھی بار بار اصرار کرتے رہے کہ معاملہ کیا ہے؟ میں کہتا رہا کہ حافظ صاحب کو باہر نکلنے دو۔ حافظ صاحب چھٹی کے بعد بھی کافی دیر بعد مدرسے سے نکلتے تھے۔اس وقت تک زیادہ تر بچے وہاں سے جا چکے ہوتے تھے۔ہم کھڑے انتظار کرتے رہے۔آخر کچھ دیر بعد وہ مسجد کے اندر سے ہوتے ہوئے بڑے پھاٹک سے باہر آئے اور جوتے زمین پر رکھ کر پہننے لگے۔ہم سب انھیں دیکھ رہے تھے۔ پاؤں ڈالنے کے ایک لمحے بعد ہی انھوں نے اپنے جوتے پھینکے اور پھر دوسرے ہی لمحے ایک ایک کو اوندھا کر کے زمین پر پٹکنے لگے۔ ابھی انھوں نے جوتوں کو اچھی طرح سے پٹکا بھی نہیں تھا کہ یکا یک اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی جگہ پر ہی اچھلنا کودنا شروع کر دیا۔وہ کبھی ایک پاؤں پٹکتے تو کبھی دوسرا اور کبھی اپنی تہمد کو پکڑ کر ادھر سے ادھر سے جھٹکنے لگتے۔حافظ صاحب کا اس طرح بے ساختہ اچھلنا کودنا اور ادھر ادھر گھومنا اور بلبلانا دیکھ کر ہم سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوئے جا رہے تھے۔ کیوں کہ اس دوران میں نے انھیں بتا دیا تھا کہ کیا کر آیا ہوں اور حافظ صاحب کی یہ ساری اضطراری قسم کی اچھل کود کس کا نتیجہ ہے۔ ہم سب ہنستے قہقہے لگاتے وہاں سے بھاگ نکلے کہ کسی نے دیکھ لیا تو اچھی طرح خبر لے گا۔

اس دن کے بعد سے انھوں نے وہاں جوتے رکھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ہمیں بھی نہیں معلوم اور نہ اس کے بعد کبھی ہمیں معلوم ہو سکا کہ وہ اب جوتے کہاں رکھنے لگے تھے۔ان کی وہ بے اختیارانہ اور بے ساختہ حرکتیں آج بھی یاد آتی ہیں تو ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ جاتی ہے۔اللہ معاف کرے اور ان کے درجات کو بلند کرے۔ بہرحال انھوں نے ہمیں ناظرہ قرآن کریم پڑھایا تھا۔بڑے نیک اور شریف انسان تھے۔

س: بچپن میں بچوں کے کون سے رسائل آپ پڑھتے تھے؟

ج: نور، کھلونا، ٹافی اور کلیاں، ان کا میں خریدار ہوا کرتا تھا۔ نور کا ریڈیو نورستان والا کالم بہت پسند تھا۔اسی طرح کھلونا کا کامکس والا حصہ بہت پسند تھا۔ ان رسالوں میں آؤٹ لائن ڈرائنگ میں بنی بختیار سعید کی تصویریں اور ان کے دستخط مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔ میں بہت غور سے انھیں دیکھا کرتا تھا اور پھر بعد میں انھیں بنانے کی کوشش بھی کرتا تھا۔بس ایک شوق تھا اور بہرحال کام بھی آیا۔اس زمانے میں چھوٹی چھوٹی کہانیوں کی بے شمار کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ اب تو ان کے نام بھی یاد نہیں۔لیکن ہاں ایک کتاب یوسف وزلیخا کی کہانی پڑھی تھی۔ وہ بس پسند آگئی اور بہت دن تک اس کے حصے یاد رہے تھے۔

مذکورہ بالا رسالے پسندیدہ رسالے تھے۔ کھلونا کا تو برسوں تک مستقل خریدار رہا اور ہر سال کے شماروں کی جلدیں بندھوا لیا کرتا تھا جو آگے چل کر جب دوسرے بھائی بہن اور گلی محلے کے کچھ اور بچوں کو معلوم ہوا تو ان کے ہاتھوں وہ جلدیں خراب ہوئیں۔ اس کے بعد تبدیلی مکانات کی وجہ سے وہ نہ جانے کہاں رہ گئیں۔

س: بچوں کے ذہنی اور فکری ارتقا کے لیے کون سی کتابیں زیادہ مفید ہیں؟

ج: (ذہنی وفکری ارتقا کے لیے ضروری ہے کہ بچے کتابیں پڑھیں۔) جو کتاب بھی میسر ہو وہ پڑھیں۔ شروع شروع میں چاہیے جس قسم کی کتاب ہو پڑھتے رہیں۔ جب شوق پیدا ہو جاتا ہے تو خود بخود تخصیص اور انتخاب کا شعور بیدار ہو جاتا ہے۔ میں انفرادی طور پر اس خیال کا حامی ہوں کہ جو روایتی کہانیاں ہیں بچپن میں انھیں ان کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنا چاہیے۔ دیووں، پریوں، جنوں اور چڑیلوں کی کہانیاں یعنی ایسی کہانیاں جن میں مافوق الفطرت عناصر ہوں اور ان کہانیوں میں محیر العقول واقعات بار بار پیش آتے ہوں ایسی کہانیاں ان کے تخیل کو مہمیز کرتی ہیں۔ ذہنی وفکری ارتقا کے لیے ایسی کتابیں مفید ہوتی ہیں۔ جس کا تخیل جتنا زیادہ تیز رفتار اور بلند پرواز ہوگا اتنی ہی اس کی تخلیقی قوت میں اضافہ ہوگا اور ذہانت کا یہی راستہ ہے۔ اکثر سائنسدانوں اور فنکاروں کی سوانحی کتب میں اس طرح کی کتابیں پڑھنے کا تذکرہ ملتا ہے۔ بعض لوگ اپنی پختہ عمری میں اور بہت زیادہ تعقل پسند اور حقیقت پسند ہونے کے زعم میں ایسی کتابوں کے پڑھنے کو فرار کا نام دیتے ہیں۔ دراصل یہ حقیقت پسندی سے فرار نہیں ہے بلکہ عمر کے اس حصے میں ذہنی بالیدگی کے لیے یہ طاقتور غذا ثابت ہوتی ہے۔ انسانی ذہن ایک انتہائی پیچیدہ چیز ہے اور اس کے متعلق اور اس طرح کا حتمی فیصلہ لینا بھی مناسب نہیں ہے۔

س: زبان و بیان کو بہتر بنانے کے لیے کن مصنفین کی کتابیں بچوں کے لیے رہنما ثابت ہوسکتی ہیں؟

ج: اسماعیل میرٹھی، شفیع الدین نیر، ڈاکٹر ذاکر حسین خان، عابد حسین کے علاوہ اس دور کے بچوں کے ادیبوں کے علاوہ موجودہ زمانے کے مروجہ رسائل کا بالضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس سے پڑھنے والوں کے اندر زبان و بیان کا شعور بھی پختہ ہو گا اور وہ اپنے مافی الضمیر کو بہتر اور موثر طریقے سے دوسروں کے سامنے رکھ سکیں گے۔ اپنا مستقبل سنوارنے کی فکر تو کیا بچپن اور لڑکپن میں اس کا شعور بھی نہیں ہوتا۔ یہ شعور اس وقت بیدار ہوتا ہے جب لڑکپن جوانی سے بغل گیر ہونے لگتا ہے۔ جوانی کی چوکھٹ پر قدم رکھتے ہی مستقبل کی فکر دامن گیر ہوتی ہے اور اسی عمر میں ایک فرد منصوبے اور فکری قلعے بناتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے یعنی بارہ سے پندرہ یا سولہ برس کی عمر تک ایک بے فکری ہوتی ہے اور اس عمر میں طلبہ اپنے شوق، دلچسپی اور پسند کے مطابق جو بھی کتاب ہاتھ لگے پڑھ ڈالیں اور انھیں اس عمر میں بے تحاشہ پڑھنا بھی چاہیے۔ اس عمر کا مطالعہ آئندہ تعلیم کی مضبوط بنیادیں فراہم کرنے کے لیے خود بخود راستہ ہموار کر دیتا ہے، اور بہت سی گرہیں یونہی کھل جاتی ہیں۔

س: اپنے سوانحی اور تعلیمی کوائف کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ج: اسی مالیگاؤں شہر کے مشہور محلے یعنی اسلام پورہ میں گاندھی جی کے قتل کے ٹھیک دس برس بعد اسی دن شام میں چونک کر چیخ پڑا۔ پیر کا دن تھا۔ اجداد کا سلسلہ یو پی کے مختلف شہروں اور قصبوں سے ملتا ہے لیکن مجھے اتنا معلوم ہے کہ میرے دادا جی منشی محمد حنیف صاحب کی پیدائش بھی اسی شہر میں ہوئی تھی۔ گیارہواں جب میٹرک ہوا کرتی تھی اس کے آخری بیچ کا طالب علم تھا۔ اس کے بعد سے دس جمع دو کا فارمولا چل

نکلا۔ میٹریکولیشن کے بعد والدین کی خواہش تھی کہ کوئی ٹیکنیکل لائن جوائن کروں۔ لیکن راہ نمائی کا فقدان تھا۔ گھر میں تعلیم کا کوئی رواج نہیں تھا اس لیے کوئی رہنمائی بھی نہیں مل سکی۔ سال یوں ہی ضائع ہو رہا تھا کیوں کہ ٹیکنیکل کالج میں آئندہ برس داخلہ ہونا تھا۔ تعلیمی سلسلہ موقوف نہ ہو اس لیے بزرگوں نے طے کیا کہ شہر کے قلب میں جو اکلوتا کالج ہے اس میں داخلہ لے لیا جائے۔ چھ مہینے تو پہلے ہی ضائع ہو چکے تھے۔ داخلہ ہوا اور کچھ ہی عرصے بعد سالانہ امتحانات شروع ہو گئے۔ اس کلاس میں کل 281 طلبہ تھے۔ نتیجہ نکلا تو چار طلبہ فرسٹ کلاس میں پاس ہوئے تھے باقی سیکنڈ اور تھرڈ میں پاس ہوئے تھے۔ ان فرسٹ کلاس پاس ہونے والوں میں تین لڑکیاں اور ایک اکلوتا لڑکا میں تھا۔ اب کیا تھا۔ گھر والے بولے اگر صرف ناول پڑھ پڑھ کر فرسٹ کلاس پاس ہوتے ہو تو پہلے اسی کالج کا سب کورس پاس کر لو پھر بعد میں دیکھیں گے۔ لیکن بی اے کرتے کرتے اتنی سمجھ تو آ ہی گئی تھی کہ آئندہ کیا کرنا ہے۔ میں وکالت کرنا چاہتا تھا لیکن شدید مخالفت ہوئی۔ اب مرتا کیا نہ کرتا بی ایڈ کیا اور نوکری تلاش کرنے لگا۔ ملازمت کرتے کرتے پی ایچ ڈی بھی ہو گیا مگر سبکدوش ہوا اسی اسکول سے جہاں ملازمت کرتا تھا۔

س: آپ کو بچوں کے لیے لکھنے کا خیال کب اور کیسے آیا؟/ آپ کی پہلی تخلیق کب اور کس رسالے میں شائع ہوئی؟

ج: بچوں کے لیے لکھنے کا کوئی خاص منصوبہ نہیں تھا۔ شروع شروع میں انگریزی میں کچھ کہانیاں اور مضامین لکھے تھے پر انھیں شائع کرنے سے جھجکتا تھا۔ 1998 میں بچوں کا ماہنامہ امنگ میں ایک کہانی بعنوان 'کچھوے کی دانائی' ارسال کی اور وہ شائع ہو گئی۔ اس کے بعد ایک دوسری کہانی بھیج دی۔ وہ بھی شائع ہو گئی۔ اتفاق کی بات ہے کہ دونوں کہانیاں کامکس کے کالم کے تحت شائع ہوئی تھیں۔ اس کے باوجود کوئی منصوبہ نہیں بنا بس کبھی کبھی کچھ لکھ لیا کرتا تھا۔ کچھ عرصہ بلکہ برسوں بعد ایک ادبی انجمن یعنی ادارۂ نثری ادب، مالیگاؤں کی داغ بیل پڑی۔ مجھے اس کا نائب صدر نامزد کیا گیا تھا۔ ادارے کی پہلی نشست سرسید ڈے کی مناسبت سے 17 اکتوبر 2003 کو منعقد کی گئی۔ اس کے بعد تواتر سے ہر ماہ کے آخری سنیچر کو ماہ بہ ماہ منعقد ہو رہی ہے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری وساری ہے۔ ادارۂ نثری ادب مالیگاؤں کی نیو رکھنے کے ساتھ ہی کچھ اصول وضوابط بھی بنا لیے گئے۔ اس میں ایک یہ بھی تھا کہ جو نثری تخلیقات پیش کی جائیں گی ان میں سب سے پہلی تخلیق ادب اطفال سے متعلق ہوگی۔ ہم نے شعوری طور پر اور ترجیحی بنیادوں پر ادب اطفال پر توجہ دی تھی اور اس کے ارتقا اور وسعت میں اضافے کے لیے جدوجہد کی ہے اور آج بھی کر رہے ہیں۔ آج تو نہ جانے کتنے خود ساختہ ادیب ہیں جنھیں اور کہیں شہرت نہیں ملی تو سینگ کٹا کر ادھر در آئے ہیں اور اپنے آپ کو ادیب الاطفال کہلوانے پر چاروں ہاتھ پاؤں سے تلے ہوئے ہیں اور کرائے کے بھونپو سے کہلوا بھی رہے ہیں۔ بہرحال ادارۂ نثری ادب کی ابتدائی چند نشستوں میں کوئی ترجمہ شدہ کہانی پیش کر دیتا اور کبھی کبھی تو ترجمہ شدہ کہانی کو اپنے ہی نام سے پڑھ بھی دیتا تھا۔ ایک آدھ نشست میں ایسا بھی ہوا کہ اس صنف سے متعلق کسی نے کوئی تخلیق نہیں پیش کی۔ اس زمانے میں 'ادیبوں' کا بچوں کے لیے لکھنا کسرِ شان سمجھا جاتا تھا اور یہ صنف قابلِ اعتنا تھی بھی نہیں۔ ہم جو ادارے کے ذمے دار تھے ہمیں اس پر بڑی شرمندگی ہوتی اور قلق بھی ہوتا کہ ہم ہی اپنے اصولوں کو پامال کر رہے ہیں۔ اس لیے میں نے اسے ایک چیلنج کے طور پر قبول کیا اور ہر ماہ نشست میں کہانی پیش کرنے لگا۔ غالباً 2004 کے آغاز سے ہی میں نے

یہ سلسلہ شروع کر دیا تھا اور الحمدللہ آج بھی جاری ہے۔اب تک سو سے زائد طبع زاد کہانیاں تحریر کر چکا ہوں۔ ترجمہ شدہ کہانیاں ان پر مستزاد ہیں۔

س: کتاب لکھنے سے پہلے آپ بچوں کی نفسیات اور ذہنی مطالبات پر ریسرچ کرتے ہیں یا نہیں؟

ج: میں کہانیوں میں قدروں کو پیش کرنے اور اپنے قاری کے دل میں ان کا احترام پیدا کرنے کے لیے لکھتا ہوں۔ لیکن میری کوشش ہوتی ہے کہ ان قدروں کو کہانی کے پلاٹ، واقعات، ڈائیلاگ اور مناظر میں اس طرح پیوست کر دوں کہ وہ ان میں چھپ کر رہ جائیں اور پڑھنے والوں کے دل و دماغ پر میری ناصحانہ اور واعظانہ تبلیغ کا کوئی بوجھ نہ پڑے، نہ ہی قدروں کی تبلیغ و اشاعت کے آگے پوری کہانی بے مزہ اور بے لطف ہو کر رہ جائے۔ کبھی کبھی میں یہ کوشش بھی کرتا ہوں کہ ایسی کہانی لکھوں جس میں صرف فسوں کاری ہو، ایک سحر ہو، اور وہ قاری کو اختتام تک باندھے رکھے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ نوعمر قاری کے اندر پڑھنے اور مطالعہ کرنے کی عادت راسخ ہو اور وہ اپنا کچھ وقت کتابوں کے ساتھ بھی گزارنے کے عادی ہو جائیں۔ ذہن میں کہانی کی بنیاد پڑتے ہی قاری کی عمر کا احساس بھی خود بخود بیدار ہو جاتا ہے۔ اکثر ایسی کہانی جو بہت کم عمر یعنی پانچ تا نو برس کے قاری کے لیے ہو، لکھنے میں بڑی پریشانی ہوتی ہے۔ بس کلیجہ خون ہوتا ہے۔ اکثر ایسی کہانیاں لکھ کر بھی اطمینان نہیں ہوتا لیکن جب کوئی اس عمر کا بچہ پسند کر لیتا ہے تو اچھا لگتا ہے۔

اسماعیل میرٹھی، شفیع الدین نیر، ڈاکٹر ذاکر حسین خان، عابد حسین کے علاوہ اس دور کے بچوں کے ادیبوں کے علاوہ موجودہ زمانے کے مروجہ رسائل کا بالضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس سے پڑھنے والوں کے اندر زبان و بیان کا شعور بھی پختہ ہوگا اور وہ اپنے مافی الضمیر کو بہتر اور موثر طریقے سے دوسروں کے سامنے رکھ سکیں گے۔

س: ادیب اطفال کی حیثیت سے ادبی اور علمی حلقے میں آپ کی قدر ہوتی ہے یا نہیں؟

ج: بچوں کے ادیب کی حیثیت سے اب ایک شناخت قائم ہو چکی ہے۔ الحمدللہ! اکثر کہانی شائع ہونے پر ملک کے کسی بھی حصے سے فون آتا ہے اور پسند کا اظہار کیا جاتا ہے۔

س: کیا آپ اب بھی بچوں کے لیے لکھی گئی کتابیں پڑھتے ہیں؟

ج: اب بھی جب موقع ملتا ہے بچوں کے لیے لکھی گئی کتابیں پڑھتا ہوں۔ امنگ اور بچوں کی دنیا تو ہر ماہ باقاعدگی سے خریدتا ہوں۔ گل بوٹے، اچھا ساتھی اور پھول کے علاوہ جو رسالہ بھی مل جاتا ہے دیکھ ڈالتا ہوں۔

س: انگریزی اور دیگر زبانوں میں شائع ہونے والے کون سے رسالے بچوں کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں؟

ج: ادب اطفال سے متعلق آج جو رسائل شائع ہو رہے ہیں وہ غنیمت ہی نہیں بہت اچھے ہیں۔ بعض کا معیار تو بہت اونچا ہے۔ دوسری زبانوں کے رسائل سے ان کا موازنہ میں مناسب نہیں سمجھتا کیونکہ ان زبانوں کے قاری اور خود ان زبانوں کا کلچر اور معیار بھی اردو زبان اور اس کے قاری کے معیار اور کلچر سے بہت مختلف ہے۔ انگریزی زبان کا اخبار ٹڈ ڈے جس میں ایک دن بچوں کا ایک حصہ مختص ہوتا ہے، دیکھتا ہوں تو کبھی کبھی شکر بھی ادا کرتا ہوں کہ اچھا ہے جو ہمارے بچے ابھی اتنے 'ایڈوانس' نہیں ہوئے ہیں۔ نیز ان کی معاشیات

میں بھی بہت بعد ہے۔ سماجی نابرابری اور ایک دوسرے کے درمیان معاشی تفاوت احساسِ کمتری پیدا کرتا ہے اور پھر یہاں سے نفسیاتی حملے، ہنس کی چال چلنے اور اپنی بھی بھولنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یہ ہمارے سماج کی ایک ٹھوس حقیقت ہے اور اس سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔

س: معاصر ادب اطفال سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

ج: معاصر ادبِ اطفال کافی ترقی کر چکا ہے اور اشاعت کے لیے نئے آسمان اور نئی منزلوں کی خبر لا رہا ہے۔

س: بچوں کے لیے لکھتے ہوئے آج کے دور میں کن موضوعات پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے؟

ج: بچوں کے لیے پر مغز موضوعات کا تعین کر کے لکھنا ٹھیک نہیں ہے۔ کہانی وہی دلوں پر راج کرتی ہے جس میں فکر و فلسفہ فنطاسیہ کے آگے سر جھکائے اس کی خدمت پر مامور ہوتے ہیں۔ لکھنے کے لیے کسی بھی موضوع کو ہاتھ لگایا جا سکتا ہے اور اسے اٹھایا جا سکتا ہے۔ موضوعات کا تنوع قاری کو مختلف جہانوں کی سیر کراتا ہے۔ لکھنے والے کا رویہ مثبت اور اس کے افکار و خیالات میں امید پروری اور رجائیت کی دھنک نمایاں ہو۔ جو قلم کار قاری کو تازگی کا احساس دلائے اور خوبصورت دنیا کو خوبصورت تر بنانے کی ترغیب دے وہ اور اس کا ادب ہمیشہ زندہ و تابندہ رہتا ہے۔

ادبِ اطفال سے بھی Activism کا کام لیا جا سکتا ہے اور لیا جا رہا ہے۔ بعض زبانوں کے بعض لکھنے والوں نے اس کی شعوری کوشش کی ہے۔ ابھی اردو میں شاید اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکا ہے۔

س: بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے کچھ مفید تجاویز اور مشورے!

ج: بچوں کی تعلیم بہت ضروری ہے۔ جس طرح تربیت گودِ مادر سے شروع ہوتی ہے اسی طرح تعلیم بھی مدرسۂ خانہ سے شروع ہوتی ہے۔ تعلیم کی بنیاد پڑ جانے کے بعد والدین نے اپنے بچوں کے لیے چاہے جو نشان متعین کر رکھا ہو یعنی وہ اسے ڈاکٹر، انجینئر، وکیل، پروفیسر یا اور جو کچھ بھی بنانا چاہتے ہوں، انھیں یہ بات ہمیشہ گرہ سے باندھ رکھنی چاہیے کہ نصابی تعلیم کے علاوہ غیر نصابی کتابیں اور سرگرمیاں ان اہداف تک رسائی میں بہت مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ انھیں اپنے بچوں کو نصاب کے علاوہ غیر نصابی کتابوں، رسالوں اور اخباروں کے مطالعے کا بھی عادی بنانا چاہیے اور سب سے بہتر یہ ہے کہ وہ خود تلاش کر کے ایسی کتابیں انھیں مہیا کریں اور بچوں کی عمر کے لحاظ سے ان کے زیرِ مطالعہ کتابوں پر ان سے تبادلۂ خیال بھی کریں۔ اس طرح بچوں کی ذہنی گرہیں کھلتی ہیں۔

س: ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' میں آپ کس نوع کی تبدیلی چاہتے ہیں؟

ج: 'بچوں کی دنیا' کی موجودہ شکل وصورت بھی بہت اچھی ہے۔ مضامین کی تعداد کم اور طلبہ کے معیار کے مطابق ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ بعض اوقات مضامین ایسے ہوتے ہیں کہ کوئی سائنسداں ہی ان سے متاثر ہوسکتا ہے اور ان کی گہرائی و گیرائی کو پہنچ سکتا ہے۔ عام طور پر نونہال اور انٹر تک کے طلبہ ان مضامین سے صرفِ نظر کر جاتے ہیں جس کا صاف مطلب ہوتا ہے کہ مضمون انھیں اپیل نہیں کر سکا ہے۔

س: بچوں کے لیے آپ کا کوئی پیغام!

بچوں کے لیے میرا صرف ایک مشورہ ہے کہ کتابیں پڑھیں، بے تحاشہ پڑھیں اور تلاش کر کر کے پڑھیں کیوں کہ ذاتی مطالعہ بہت سی گتھیاں خود بخود سلجھا دیتا ہے اور مستقبل میں بہت سی چیزیں آسان ہو جاتی ہیں۔

■

Dr. Iqbal Berki
155, MHADA, Noor Bagh,
Malegaon-42320, Dist Nasik
(Maharashtra) Mob.: 8329273266

شاہد جمیل

میرا روبوٹ

میرا ننھا سا روبوٹ　توڑ کے لادیتا اخروٹ
یہ ریموٹ سے چلتا ہے　کہنا میرا سنتا ہے
اس کی آنکھیں چمکیلی　تھوڑی تھوڑی شرمیلی
سب باتوں پر غور کرے　اور نہ کوئی شور کرے
جب ریموٹ دباتا ہوں　چلتا اس کو پاتا ہوں
میز کو جاکر صاف کرے　قلم قرینے سے رکھ دے
پلنگ کے نیچے گھس جائے　پنسل ڈھونڈ کے لے آئے
اور اشارہ پاتے ہی　تھوڑا آنکھ دکھاتے ہی
الماری سے ایک کتاب　لے کر فوراً آئے جناب
جوں ہی بٹن دبایا پھر　لنچ ہے ٹیبل پر حاضر
ساتھ یہ میرے، کھیلے بھی　چھپ جاؤں تو ڈھونڈے بھی
کرتا میرے سارے کام　کیسی چھٹی، کیا آرام؟
جہاں بٹھا دو، رہے وہیں　پیٹ کی، اس کو فکر نہیں
رات کو جب ہم سو جاتے　بس، یہ بیٹھا یہ سوچے
دن نکلے تو کام کروں!
میں کیونکر آرام کروں؟

■

Shahid Jameel
202- R.D Mansion,
Ashiana- Digha Road (Nr. Axis Bank)
P.O.: B.V. College Patna- 800014 (Bihar)
Mob.: 9471094149

نظم

اسد رضا

ایک ٹھٹھری ہوئی نظم

ٹھنڈے ٹھنڈے ہیں کھلونے آرزو ٹھٹھری ہوئی
چائے کافی کی میاں ہے جستجو ٹھٹھری ہوئی

ہر طرف گویا جہاں پر سردیوں کا راج ہے
بس نظر آتی ہے ہر شے کو بہ کو ٹھٹھری ہوئی

ناک ہے سن دوستو! ہیں دانت بھی بجتے ہوئے
ذکر کیا ہونٹوں کا اب ہے گفتگو ٹھٹھری ہوئی

پتے پتے پر چمن میں برف ہی بس برف ہے
ٹھنڈی ٹھنڈی سی کلی ہے گل کی بو ٹھٹھری ہوئی

دن کا کہرا کہہ رہا ہے مسکرا کر بس یہی
اے اندھیری رات کتنی اب ہے تو ٹھٹھری ہوئی

لیٹے رہیے سارے دن اب ڈال کر کمبل لحاف
کھیلنے کی بھی ہے یارو جستجو ٹھٹھری ہوئی

سرد لہروں کا اسد ہر ایک جانب زور ہے
کیوں نہ اس موسم میں ہو محسوس لو ٹھٹھری ہوئی

■

Asad Raza
97 F, Sector 7, Jasola Vihar
Okhla
New Delhi- 110025
Mob.: 9873687378

رخشاں ہاشمی

میٹھی بولی

میٹھی میٹھی نان خطائی
میٹھا حلوا اور ملائی

میٹھا گاجر کا حلوہ ہے
میٹھا لڈو اور پیڑا ہے

میٹھی فروٹی میٹھا مازا
پیٹھا کھاؤ ہے یہ تازہ

میٹھی ہوتی کاجو کتلی
میٹھی ہوتی گڑ کی ڈلی

میٹھی میٹھی اردو بولو
تم کانوں میں یوں رس گھولو

میٹھا کھاؤ میٹھا بولو
جب منہ کھولو سچا بولو

■

Rakhshan Hashmi
Hashmi Maskan, Rizvi Colony
Shah Zubair Road
Munger- 811201 (Bihar)
Mob.: 9304342562

شمیم انجم وارثی

طوطا

پنجرے میں جو اک طوطا ہے
قید میں بھی رہ کر ہنستا ہے

سبز پروں کی اوڑھ کے چادر
مستی میں رہتا ہے اکثر

کہیں پہ مٹھو نام ہے اس کا
کوئی پکارے کہہ کر سوگا

دروازے پر دستک پاکر
فوراً پوچھے کون ہے باہر

بھوک لگے غصہ ہو جائے
ٹیں ٹیں کی آواز لگائے

بھردے چنے سے میری کٹوری
روز اللہ سے مانگے روزی

رب کی ہمیشہ حمد کرے یہ
نعت نبی کی روز پڑھے یہ

نقل کرے یہ سب کی بولی
بچوں کو سمجھے ہمجولی

ہے اس سے دہلیز کی رونق
گھر، آنگن ہر چیز کی رونق

■

Shamim Anjum Warsi
237/2, Arbinda Pally
Garulia, Shimali 24
Pargana- 743133 (West Bengal)
Mob.: 933968079

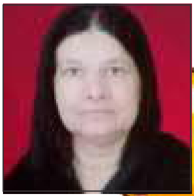

تبسم سحر

عزم

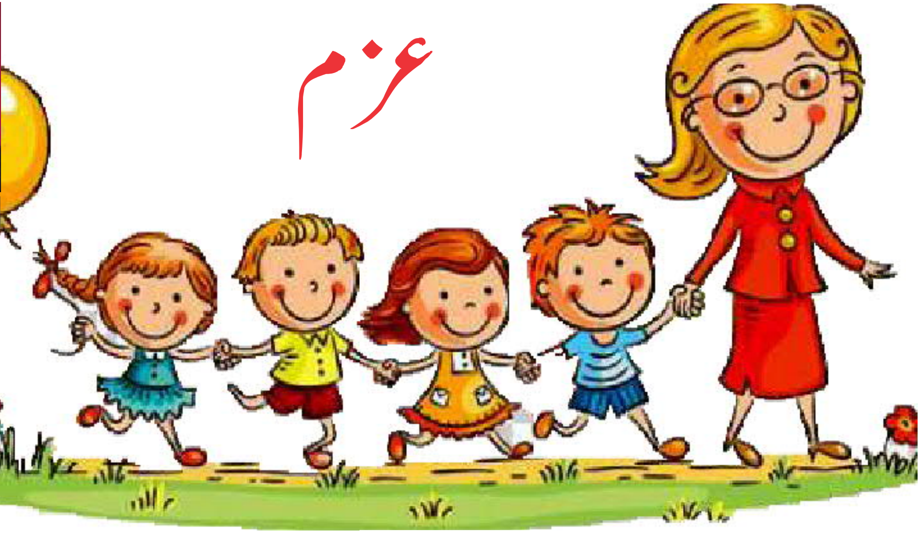

بڑے زور کی چل رہی ہیں ہوائیں
چراغوں کو اپنے لہو سے جلائیں

نہ گھبرائیں، مہماں ہیں کچھ گھڑی کی
جو چھا جائیں سر پر غموں کی گھٹائیں

ہمیں چاہیے کہ چلیں راہ سیدھی
بھٹک جائیں جوان کو رستہ دکھائیں

نہ بدظن کبھی ہوں گے ہم دوستوں سے
کہیں دشمنوں سے کہ وہ باز آئیں

عمل کے گل و لالہ تحفے میں دے کر
معطر کریں ہم وطن کی فضائیں

غریبوں کی خدمت کریں جان و دل سے
خدا کو پسند آتی ہیں یہ ادائیں

کریں ایسی خدمت کہ دل ان کے خوش ہوں
بزرگوں سے ہم اپنے پائیں دعائیں

کتابوں میں حکمت ہے سارے جہاں کی
خوشی سے پڑھیں اور خوشی سے پڑھائیں

اگر جی چرائیں گے ہم علم و فن سے
زمانہ ہمیں دے گا اس کی سزائیں

چلو قافلہ ہو نہ جائے روانہ
جرس بن کے سوتے ہوؤں کو جگائیں

جہاں پیار کی ہو سدا حکمرانی
سحر آؤ، اک ایسی دنیا بسائیں

■

Tabassum Sahar
Novel Heights, 12
Near Delta Royal and Datta Mandir
Satvik Nagar, Pakhal Road
Nashik- 422011 (Maharashtra)
Mob.: 8888315125

نظم

فہیم احمد

چلیں مدرسے

آؤ نازش، عادل، اکرم
چلو، چلو، ہم چلیں مدرسے

ٹن ٹن گھنٹی بجتی دیکھو
اب پڑھنے کا وقت ہوا ہے
چلو، اٹھاؤ بستے جلدی
ہونے والی ابھی دعا ہے
دل میں ننھی امیدیں لے
نکلو اپنے گھر سے
چلو، چلو، ہم چلیں مدرسے

کاپی، قلم، کتابیں، بستے
یہ ہیں سچے دوست ہمارے
اگر دوستی پکی ہو تو
قدموں میں ہیں چاندستارے
پڑھ لکھ کر قابل بن جائیں
خوشحالی آنگن میں برسے
چلو، چلو، ہم چلیں مدرسے

دیش ہمارا ایک چمن ہے
ہم سب اسی چمن کی کلیاں
پڑھ لکھ کر روشن کر دیں گے
گاؤں شہر کی ساری گلیاں
ہم چاہیں پڑھنے لکھنے کو
کوئی بچہ کبھی نہ ترسے
چلو، چلو، ہم چلیں مدرسے

■

Dr. Faheem Ahmad
Asst. Prof. Dept of Hind
Mahatma Gandhi Memorial (P.G.) College
Chaudhary Sarai
Sambhal- 244302 (UP)
Mob.: 8896340824

جاوید رانا

اسکول کا ترانہ

چندا ہے اسکول ہمارا تارا ہے اسکول ہمارا
جس کا کوئی مول نہیں ہے ایسا ہے اسکول ہمارا

رحمت حق کا سر پہ ہمارے سایہ ہے اسکول ہمارا
مہر و محبت عشق و وفا کا چشمہ ہے اسکول ہمارا

ماں کے اجلے آنچل جیسا باپ کے پیارے کاندھوں جیسا
ہم کو سارے جہاں سے پیارا لگتا ہے اسکول ہمارا

اس کے دامن سے ملتے ہیں ہیرے موتی لعل و جواہر
علم کا ساگر گیان کی بہتی گنگا ہے اسکول ہمارا

کھیلیں کودیں دھوم مچائیں دھرتی سے آکاش پہ جائیں
دل کا سکوں اور آنکھ کا تارا نیارا ہے اسکول ہمارا

سیدھی راہ دکھانے والا گمراہی سے بچانے والا
منزل پر پہنچانے والا رستہ ہے اسکول ہمارا

بھاشاؤں کے پاک صحیفے سچی باتیں سچے قصے
رنگ برنگ کے پھولوں کا گل دستہ ہے اسکول ہمارا

ہے تہذیب کا یہ میخانہ حسن عمل کا یہ پیمانہ
اخلاق و مروت عقل و خرد کا بادہ ہے اسکول ہمارا

خسرو، میر، کبیر اور غالب ہم سے باتیں کرتے ہیں رانا
میٹھی میٹھی آوازوں کا نغمہ ہے اسکول ہمارا

■

Javed Rana
143/29, Near Char Mazar
Dr. Zakir Husain Ward, Mominpura
Burhanpur- 450331 (MP)
Mob.: 7000477625

پہاڑ

وسیم احمد نگرامی

ذرہ ذرہ بنا پہاڑ
کھڑا ہوا ہے تنا پہاڑ
سر پہ اوڑھے برف کی چادر
چھلکاتا پانی کی گاگر
کل کل کل کل کرتے جھرنے
آ جاتے دھرتی تر کرنے
بارش میں بارش ہو جائے
رہتا ہر دم اڑا پہاڑ
ذرہ ذرہ بنا پہاڑ
خوبصورت اور پیارے پیارے
لگتے دلکش اس کے نظارے
رنگ برنگا نیارا نیارا
قدرت کا انمول ستارا
سورج کی کرنیں پڑنے پر
لگتا موتی جڑا پہاڑ
ذرہ ذرہ بنا پہاڑ
دھرتی کا سوکھا پن ہرتے
تال پوکھروں کو یہ بھرتے
اسے دیکھتے اور للچاتے
سیلانی جو اس تک آتے
کسی کو چوٹی پر چڑھنے سے
کرے کبھی نہ منع پہاڑ
ذرہ ذرہ بنا پہاڑ
کھڑا ہوا ہے تنا پہاڑ

■

Wasim Ahmad Nagrami
10/42, Nagram Bazar
Lucknow- 226303 (UP)
Mob.: 9198931894

شکیل حنیف

کام ایسا ماں ہی کرسکتی ہے بس

یہ کہانی ہے مگر سنیے ذرا
پیکرِ ایثار سے ملیے ذرا
ایک جنگل میں تھی اک ہرنی حسیں
چر رہی تھی ساتھ بچوں کے کہیں
دیکھ کر سبزے کو اور نیلا گگن
شاد تھی وہ اور بچے تھے مگن
پھر اچانک سانحہ یہ ہو گیا
چین ہرنی کا سراسر کھو گیا
جھنڈ چیتوں کا وہاں وارد ہوا
دیکھ یہ بے چین اس کا دل ہوا
خوف تھا لیکن رہی وہ ہوش میں
ماں کی ممتا آگئی پھر جوش میں
بھاگنا آساں تھا لیکن رک گئی
ماں تھی وہ بچوں کی خاطر جھک گئی
اس نے سوچا بھاگ تو جاؤں گی میں
اپنے بچوں کو نہیں پاؤں گی میں
یہ خیال آتے ہی ہرنی تھم گئی
پیش خود کو کر دیا وہ جم گئی
سب درندے اس طرف آنے لگے
مل کے پھر اس ماں کو ہی کھانے لگے
جب ملا موقع تو بچے چل دیے
ماں نے گویا زندگی کے پل دیے
مطمئن تھی ان کو جاتا دیکھ کر
چہرہ بالکل پرسکوں ، اونچا تھا سر
دم نکلنے تک نہ تھی وہ ٹس سے مس
کام ایسا ماں ہی کرسکتی ہے بس

■

Shakeel Haneef
H. No. 11, Sabir Pahelwan Road,
Bhaikalla,
Malegaon- 423203 (Maharashtra)
Mob.: 8087003917

عذرا خاتون

ماں باپ

ہیں ماں باپ قدرت کا انمول تحفہ
کبھی ان کی خدمت سے جی نہ چرانا
غلط کام سے گر کبھی تم کو روکیں
تو غصے میں ان کو نہ آنکھیں دکھانا
کبھی قدر ان کی یتیموں سے پوچھو
سنائیں گے رو کر وہ اپنا فسانہ
سنا ہے کہ قدموں میں ان کے ہے جنت
تو جنت کو یوں ہی نہیں تم گنوانا
کہ جس کام سے ان کو تکلیف پہنچے
اٹھانا نہ ایسے قدم جارحانہ
بڑے اور چھوٹے کی عزت کرو تم
کبھی تلخ گوئی سے مت پیش آنا
بزرگوں کا بھی تم سدا خیال رکھنا
وہ دیں گے دعائیں تمھیں والہانہ
بڑا ہو کہ چھوٹا نہیں اس سے مطلب
تمھیں چاہیے سب کے ہی کام آنا

کبھی زندگی میں کوئی غم نہ آئے
اگر آ بھی جائے یوں ہی مسکرانا
دعا ہے کہ دنیا سے جب ہم بھی جائیں
تو لب پر ہمارے ہو کلمہ ترانا
یہ دنیا تو بس چار دن کا ہے میلہ
کہ ہم کو تو اک دن ہے سب چھوڑ جانا
کرو کام اچھے بنو نیک بچے
خدا بھی ہو خوش اور دیکھے زمانہ
اگر مٹ گئے ہم کبھی اس جہاں سے
تو پڑھنا جنازہ میرا غائبانہ
دعا ہے خدا سے ہماری یہ بچو!
کہ جنت میں سب کے لیے گھر بنانا

■

Azra Khatoon W/o Anis Ahmad
Hasan Makkha Sani
Mau- 275101 (UP)
Mob.: 8960829824

جہانگیر انس

نیا کھیل

اتوار کا دن تھا۔ آفس کی چھٹی کی وجہ سے ابا گھر پر ہی تھے۔ وہ اتوار کا پورا دن گھر والوں کے ساتھ گزارتے۔ بڑے بھائی رحیم اور میں یعنی کریم، دونوں بھائیوں نے ابا کے ساتھ ہی صبح کا ناشتہ کیا تھا۔ ہم صرف اتوار کے دن ہی ابا کے ساتھ تینوں وقت کا کھانا کھاتے اس لیے ہمیں شدت سے اتوار کے دن کا انتظار رہتا۔

ہم دونوں بھائی روزانہ صبح چھ بجے اسکول چلے جاتے۔ ابا رات کو دیر تک آفس کا کام کرتے اس لیے وہ صبح کچھ دیر سے بیدار ہوتے۔ ان کے آفس کا ٹائم نو بجے سے تھا۔ شام کو جب ابا آفس سے واپس آتے اس وقت ہم دونوں بھائی مسجد کے امام صاحب کے پاس اردو اور عربی پڑھنے گئے ہوتے۔

ہمارے محلے کے زیادہ تر لڑکے انگلش میڈیم اسکول میں پڑھتے تھے۔ محلے میں سرکاری اسکول بھی تھا، لیکن چند غریب لوگوں کو چھوڑ کر کوئی بھی اپنے بچوں کو سرکاری اسکول میں نہیں پڑھانا چاہتا۔ سب یہی سوچتے کہ انگلش میڈیم اسکول میں پڑھے بغیر کوئی بچہ اعلیٰ مقام حاصل نہیں کر سکتا۔ بعض لوگ ایسے بھی تھے جن کی آمدنی اپنے بچوں کو انگلش اسکول میں پڑھانے کی نہیں تھی لیکن وہ بھی اپنے اخراجات میں کٹوتی کر کے، دوسروں سے قرض لے کر اپنے بچوں کو انگلش اسکول میں پڑھاتے۔ انھیں اپنے بچوں کی تعلیم سے زیادہ اس بات کی فکر ستاتی رہتی کہ اگر میرے بچے انگلش اسکول میں نہیں گئے تو لوگ مجھے کم تر سمجھیں گے۔ ''ہم بھی کسی سے کم نہیں'' کا بھوت ہمیشہ ان کے سر پر سوار رہتا۔

محلے کی مسجد کے امام صاحب کا خیال کچھ الگ تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ بچے مادری زبان میں ہی بہتر تعلیم حاصل کر سکتے ہیں اور زندگی میں اعلیٰ مقام حاصل کر سکتے ہیں، لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ امام صاحب نئے دور کے بچوں کی بے راہ روی کی وجہ ان کی مادری زبان سے دوری اور مذہبی تعلیم سے بے تعلقی کو سمجھتے۔ وہ مغرب کی نماز کے بعد ایک گھنٹے اور عشا کی نماز کے بعد ایک گھنٹے بچوں کو اردو اور عربی کی تعلیم فی سبیل اللہ دیتے تاکہ بچے اپنی تہذیبی وراثت اور دین کی باتوں سے واقف ہو سکیں۔ وہ غریب بچوں کو اپنی محدود آمدنی میں سے کچھ پیسہ نکال کر انھیں اردو اور عربی کی کتاب بھی خرید دیتے۔ ان کے اس نیک جذبے سے متاثر ہو کر بہت سے لوگ اپنے بچوں کو اردو و عربی پڑھنے کے لیے بھیجنے لگتے تھے۔

صبح کا ناشتہ کرنے کے بعد ہم دونوں بھائی ابا کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ابا ہم سے تعلیم کے تعلق سے سوال کر رہے

تھے اگر ہم صحیح جواب دیتے تو وہ تعریف کرتے اگر کسی سوال کا جواب نہ دے پاتے تو نہایت ہی شفقت سے سمجھاتے۔ دل لگا کر پڑھنے کی تنبیہ کرتے، بقول ان کے علم سے بڑی کوئی دولت نہیں، یہ ایسی دولت ہے جسے نہ کوئی چور چرا سکتا ہے نہ کوئی زور زبردستی سے چھین سکتا ہے۔ علم دنیا کی واحد چیز ہے جو جتنا خرچ کی جاتی ہے اتنا ہی زیادہ بڑھتی ہے۔

دس بجے کے قریب پڑوس کے رحیم چچا دروازے پر آ کر آواز دینے لگے۔ رحیم چچا کی تعلیم واجبی ہے۔ وہ ایک سیدھے سادے انسان ہیں۔ محنت مزدوری کر کے اپنے بال بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔ آمدنی کم ہے بہت کفایت شعاری اور مشکل سے گھر کے اخراجات پورا کر پاتے ہیں، ان کے چہرے پر ہمیشہ پریشانی اور اداسی جھلکتی رہتی ہے۔ ان میں خودداری اتنی ہے کہ اپنی پریشانی اور تکلیف کا کسی سے ذکر نہیں کرتے۔ ہر شخص کے موقع پر حاضر رہتے ہیں۔ ان کے اندر بس ایک ہی خرابی ہے کہ خود کو بہت زیادہ عقلمند سمجھتے ہیں۔

ابا نے انھیں ڈرائنگ روم میں بلا لیا۔ ہمیشہ پریشان اور مایوس رہنے والے رحیم چچا کا چہرہ اس وقت خوشی سے چمک رہا تھا۔ ان کے ہاتھ میں مٹھائی کا ایک ڈبہ تھا۔ انھوں نے ڈبے سے نکال کر ایک رَس گلا ہم دونوں بھائیوں کو دیا اور ایک رس گلا ابا کو دیا۔ ابا نے مزاحیہ انداز میں پوچھا ''کس خوشی میں مٹھائی کھلا رہے ہو؟''

رحیم چچا نے ہنستے ہوئے کہا ''ایک بہت بڑی خوش خبری ہے منھ میٹھا کر لیں تو سناتا ہوں۔''

ہم لوگوں نے رس گلا کھا لیا تو ابا نے کہا ''ہاں بھئی رحیم، ہم لوگوں نے منھ میٹھا کر لیا اب بتاؤ کون سی خوش خبری ہے۔''

رحیم چچا نے جوش بھرے لہجے میں کہا: ''میرے نام سے دس لاکھ کی لاٹری نکلی ہے۔''

ابا نے حیرت سے ان کے چہرے کی طرف دیکھا ور کہا ''لاٹری پر تو سرکار کی طرف سے پابندی لگی ہوئی ہے۔ پھر تم نے کہاں سے لاٹری کا ٹکٹ خرید لیا اور تمھارے نام سے لاٹری نکل آئی۔''

رحیم چچا نے معصومیت سے کہا ''میں نے لاٹری کا ٹکٹ نہیں خریدا تھا، لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب دینا چاہتے ہیں تو چھپر پھاڑ کر دیتے ہیں، بس یہ سمجھ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے چھپر پھاڑ کر دیا ہے۔''

ابا نے پرتجسس کے لہجے میں کہا ''ارے بھائی صاف صاف کچھ بتاؤ گے یا پہیلی بجھاتے رہو گے۔''

رحیم چچا نے بتایا ''میں نے ایک دوا کمپنی سے کمر درد کی دوا منگوایا تھا، وہ بہت بڑی کمپنی ہے۔ ایک سال کے اندر اس کمپنی سے جتنے لوگ دوا منگواتے ہیں دسمبر میں کمپنی ان تمام لوگوں کے نام لاٹری نکالتی ہے اور اول آنے والے کو دس لاکھ روپے انعام دیتی ہے اس سال میرا نام اول آیا ہے۔''

ابا نے پوچھا ''کیا کمپنی دوا کے پیکٹ پر اس بات کو شائع کرتی ہے کہ ایک سال کے اندر دوا خریدنے والوں کے نام سے دس لاکھ کی لاٹری نکالی جائے گی۔''

رحیم چچا نے کہا ''نہیں، اس قسم کی کوئی بات دوا کے پیکٹ پر درج نہیں رہتی ہے۔''

ابا نے سوال کیا ''پھر تمھیں کیسے اطلاع ملی کہ کمپنی ہر سال لاٹری نکالتی ہے اور اس سال تمھارے نام سے لاٹری نکلی ہے؟''

رحیم چچا نے جواب دیا کمپنی کے ایک نمائندے نے فون کیا تھا اسی کے ذریعے مجھے یہ اطلاع ملی ہے۔ اس نے ایک وہاٹس ایپ نمبر بھی دیا ہے اور اس نمبر پر میرے آدھار کارڈ، پین کارڈ اور بینک اکاؤنٹ کا زیروکس کاپی طلب کیا ہے۔ کاغذی کام مکمل ہونے کے بعد میرے بینک اکاؤنٹ میں دس

لاکھ روپے کمپنی ٹرانسفر کردے گی۔

ابا نے ایک اور سوال کیا ”کیا تم نے کمپنی کے ہیڈ آفس سے اس بات کی تصدیق کی ہے۔“

رحیم چچا نے کہا ”کمپنی کے نمائندے نے ہیڈ آفس میں فون کرنے سے منع کیا ہے۔ کمپنی میں کئی شعبے ہیں اور ہر شعبے کا اپنا اپنا کام ہے۔ لاٹری کے ذریعے انعام دینے کا شعبہ الگ ہے اور دیا گیا نمبر اسی شعبے کا ہے۔ جو بھی بات ہوگی اسی نمبر پر ہوگی۔“

ابا نے سمجھایا دیکھو بھئی رحیم، تم ایک سیدھے سادے محنتی اور نیک انسان ہو، اس قسم کے جھمیلے میں مت پڑو۔ آج کل سائبر ٹھگی عام بات ہوگئی ہے۔ انسان کے اندر خودغرضی اور مادہ پرستی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ حرام وحلال اور جائز وناجائز کا فرق مٹ گیا ہے۔ پہلے چوری ڈکیتی ہوتی تھی لیکن ڈیجیٹل دنیا نے ناجائز طریقے سے دولت حاصل کرنے کے اتنے دروازے کھول دیے ہیں کہ اس کو پہچاننا عام لوگ تو عام لوگ بڑے بڑے تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے بھی مشکل ہوگیا ہے۔ انسان دولت کے پیچھے اتنا دیوانہ ہوگیا ہے کہ ذلیل سے ذلیل حرکت کے ذریعے بھی دولت حاصل کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتا۔ بچوں کو کڈنیپ کرکے ان کو اپاہج بنا کر بھیک منگوانا، جوانوں کو نوکری کی لالچ دے کر ان کے گردے نکال کر بیچ دینا، لوگوں کو بیوقوف بنا کر کنگال بنا دینا عام ہوگیا ہے۔

رحیم چچا نے ابا کی باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے کانوں سے نکال دیا۔ اور خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے۔ ابا کی نصیحت شاید ان کو بری لگی تھی۔

اس واقعے کے پندرہ بیس دنوں کے بعد ایک دن دو بجے کے قریب رحیم چچا کے گھر سے زور زور سے رونے کی آواز آرہی تھی۔ گاؤں کے بہت سے لوگ ان کے دروازے پر جمع ہوگئے۔ رحیم چچا ایک چارپائی پر پڑے خلا کی طرف گھور رہے تھے۔ شاید وہ دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے کوئی شکوہ کررہے تھے۔ ان کا چہرہ غم والم سے پیلا ہوگیا تھا جیسے برسوں کے بیمار ہوں، روتے روتے آنسو خشک ہوگئے تھے۔

لوگوں کے دریافت کرنے پر ان کے بڑے لڑکے نے بتایا ”ابا نے باجی کی شادی کے لیے گاؤں کی اکلوتی زمین بیچ کر پانچ لاکھ روپے اپنے بینک میں جمع کرایا تھا۔ اگلے مہینے باجی کی شادی ہے۔ ایک دن ان کے نام سے فون آیا کہ ان کے نام سے دس لاکھ کی لاٹری نکلی ہے۔ گھر میں کسی کو بتائے بغیر انھوں نے اپنا آدھار کارڈ، پین کارڈ اور بینک پاس بک کی زیروکس کاپی بتائے ہوئے وہاٹس ایپ نمبر پر بھیج دیا۔ اس کے بعد فون آیا کہ کاغذاتی کام مکمل ہوگیا ہے۔ انعام کی رقم پر دولکھ ٹیکس لگے گا، ٹیکس کی رقم جمع کرنے کے بعد دس لاکھ روپے آپ کے بینک اکاؤنٹ میں کمپنی ٹرانسفر کردے گی ابا نے دو لاکھ روپے بھی بھیج دیا۔ آج جب وہ لاٹری کی رقم کی معلومات حاصل کرنے بینک میں گئے تو معلوم ہوا کہ بینک اکاؤنٹ سے باقی رقم بھی غائب ہوچکی ہے۔ بینک کے منیجر سے شکایت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ کسی سائبر ٹھگ کا کام ہے۔ آپ تھانے میں ایف آئی آر درج کرادیں۔ دیے گئے نمبر پر ابا نے بار بار فون کیا لیکن وہ نمبر بند ہوچکا ہے۔

بچو! اسی لیے کہا گیا ہے لالچ بری بلا ہے۔ اگر تمھیں بھی کوئی کسی قسم کی لالچ دے اس کی بات میں ہرگز نہ آنا، اگر کوئی اجنبی آدمی کھانے پینے کی کوئی چیز دے تو کبھی لینے کی کوشش مت کرنا اور اپنے والدین سے اس بات کا ذکر کرنا نہ بھولنا۔ آج کل یہ نیا کھیل عام ہے۔

■

Jahangeer Uns (Mojibur Rahman)
Ranipur, Barharai
Siwan- 841232 (Bihar)

سپنوں کا عکس

انور ادیب

رام داس پسینے میں شرابور تھا۔ اس کے پیر رکشا کے پیڈل پر تیزی سے حرکت کر رہے تھے اور اس کی نگاہیں راستے پر جمی ہوئی تھیں۔ رکشے میں ایک پتلا دُبلا شخص بیٹھا تھا۔ شاید کے تیزی سے بھاگنے کی وجہ یہی تھی۔ وہ رام داس کو بار بار رکشہ تیز چلانے کو کہہ رہا تھا۔ شاید اسے اپنی منزل پر پہنچنے کی جلدی تھی۔ لیکن رام داس کو بھی اس سے کم جلدی نہیں تھی۔ اس کا بچہ بیمار تھا۔ اسے دوا خریدنی تھی اور دوا خریدنے کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ اس نے سوچا جلدی کچھ پیسے کما لوں تا کہ بچے کی دوا خرید سکوں۔ یہی وجہ تھی کہ اس سخت گرمی اور چلچلاتی دھوپ میں بھی وہ رکشا لے کر نکل پڑا تھا اور اتفاق سے اُسے ایک سواری مل گئی تھی۔ لیکن کیا اُس پیسے سے وہ دوا خرید سکے گا؟ وہ سوچتا رہا اور اس کے پیر تیزی سے پیڈل پر حرکت کرتے رہے۔ بھگوان نے چاہا تو اور بھی سواریاں مل جائیں گی۔ اب وہ کسی قدر مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اُسے بھگوان پر بہت بھروسہ تھا۔

اُسے دو چیزیں بہت پیاری تھیں۔ مالتی اس کی جیون ساتھی اور اس کا اکلوتا بیٹا امر۔ اس کی امیدوں اور سپنوں کا مرکز۔ اسی امر کی دوا کے لیے وہ پریشان تھا۔ ''اور ہاں گھر میں غلہ بھی تو ختم ہوگیا ہے۔ مالتی کی ساڑی بھی پھٹ گئی ہے۔ برا ہو اس گرانی کا، پیسے بچتے ہی نہیں اور پھر بچے کی بیماری، دوا دارو پر بھی تو خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اب میں رات کو بھی رکشا چلایا کروں گا۔ لیکن مالتی رات کو رکشا چلانے کو منع کرتی ہے۔ میں اسے سمجھا لوں گا۔ بھلا دن بھر کی کمائی کا کیا ہوگا؟'' اچانک اس کی سوچ کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ''رکشا روکو! تم نے تو میری جان ہی لے لی تھی۔'' رکشا پر بیٹھے بابو نے چلا کر کہا۔ دراصل اس کا رکشا ایک کار سے ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا۔ اس نے ایک طرف رکشا روکا۔ رکشا میں بیٹھا سوار کود کر رکشا سے اُترا اور سامنے کی گلی میں غائب ہوگیا۔ رام داس اس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ جب واپسی میں دیر ہوئی تو رام داس رکشا پر بیٹھ کر آگے بڑھ گیا۔ ''شاید بابو مجھ سے زیادہ پریشان تھے۔ تب ہی تو کرایہ دینا بھول گئے۔'' اس نے سوچا۔ اسے اپنی بیوی مالتی کی باتیں یاد آنے لگیں جو تھی تو ان پڑھ لیکن باتیں پتے کی کرتی تھی۔ وہ اکثر رام داس سے پوچھتی ''انسان اتنا خودغرض کیوں ہے؟ امیری اور غریبی میں اتنا فرق کیوں ہے؟'' رام داس بھلا ان باتوں کا کیا جواب دیتا۔ وہ تو خود بھی ان پڑھ تھا۔ ہاں وہ سوچتا ضرور تھا۔ جتنا وہ سوچتا اتنا ہی اس کا ذہن الجھتا جاتا۔ اسے اپنی اُن باتوں کا ایک ہی جواب سمجھ میں آتا۔ یہ سب تقدیر کی بات ہے۔

''رکشا!'' اچانک ایک آواز نے اس کی سوچ کا سلسلہ توڑ دیا۔

''جی میم صاحب!'' رام داس نے جواب دیا اور رکشا اس کے پاس روک دیا۔

''سٹی کالج'' عورت نے رکشا میں بیٹھ کر کہا۔

رام داس کا رکشا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے سٹی

کالج کے پاس جا کر دم لیا۔ عورت رکشا سے اُتری اور رام داس کے ہاتھ میں نوٹ تھما کر آگے بڑھ گئی۔ ''میم صاحب! باقی پیسے تو لیتی جایئے۔'' رام داس نے آواز دی۔ عورت نے اشارے سے باقی پیسے رکھنے کو کہا۔

''واہ! بھگوان! کیا تیری لیلا ہے۔ کہیں دھوپ، کہیں چھاؤں۔ انسان کے انیک روپ۔'' رام داس کچھ اور کہتا کہ اچانک اسے ہوش آ گیا۔ اسے اپنا بیمار بچہ امر یاد آ گیا۔ وہ تیزی سے گھر کی طرف چل پڑا۔ راستے میں اس نے دوا کی دکان سے دوا لی۔ گھر پہنچ کر اس نے رکشا ایک طرف کھڑا کیا۔ گھر میں قدم رکھا تو مالتی پر نظر پڑی۔

''بہت دیر کر دی۔'' مالتی نے کہا۔

''منا کیسا ہے؟'' رام داس نے اس سے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بے تابی سے پوچھا۔

''ٹھیک ہے، سو رہا ہے۔ تم منہ دھو لو میں کھانا لاتی ہوں۔''

''پہلے تم منے کو دوا پلاؤ۔'' رام داس نے دوا کی شیشی اسے دیتے ہوئے کہا۔

''دوا تو میں نے پلا دی۔ یہ پڑوس کی ریحانہ بی بی کی مہربانی ہے۔ انھیں جب معلوم ہوا کہ منا بیمار ہے تو انھوں نے منے کی دوا اور دودھ کے لیے پچاس روپے دیے۔ میں نے منے کو دوا اور دودھ کے ساتھ آٹا اور سبزی بھی منگا لی۔'' مالتی نے بتایا۔ رام داس خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کے چہرے کے کربناک لکیر سے مالتی سمجھ گئی کہ رام داس کو اس کے رویے سے تکلیف ہوئی۔ وہ اس کے مزاج سے واقف تھی۔ اس نے اس کے درد کو کم کرنے کے لیے کہا: ''یہ پیسے انھوں نے بطورِ قرض دیے ہیں، انھوں نے کہا تھا کہ اسے قرض سمجھ کر رکھ لو جب دل چاہے واپس کر دینا۔ اس وقت منے کی دوا ضروری ہے۔''

رام داس غریب تھا لیکن خوددار۔ شروع میں لوگ اسے مغرور سمجھتے تھے لیکن آہستہ آہستہ یہ غلط فہمی دور ہو گئی۔ رام داس نے اپنی خدمت سے ان کا دل جیت لیا۔ اب وہ پڑوسیوں میں کافی ہر دلعزیز تھا۔

رام داس ریحانہ بی بی کے ہمدردانہ سلوک سے کافی متاثر ہوا۔ اس نے سوچا کہ ''جو دوسرے کے کام آئے وہی بڑا ہے۔''

امر، رام داس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جو کافی دنوں کے بعد ان کی زندگی میں خوشیاں بکھیرنے آیا تھا۔ بچے کی پیدائش کے بعد ہی سے رام داس نے سپنا دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اس کا سپنا اوروں کے سپنوں سے مختلف تھا۔ لوگ عام طور پر اپنے بچے کو بڑے آدمی بننے کا سپنا دیکھتے ہیں۔ لیکن رام داس اس کی سوچ سے بڑا انسان بنانا چاہتا تھا۔ ایسا انسان جس پر انسانیت فخر کرے، جو روشنی کا مینار ہو۔

رام داس خاموش طبع اور کم گو تھا۔ ہاں جب مالتی امر کی پڑھائی لکھائی کی بات کرتی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رام داس بھی منہ میں زبان رکھتا ہے۔ وہ نہایت جذباتی انداز میں اپنے ان سپنوں کا ذکر کرتا جو امر کے متعلق دیکھتا تھا۔ مالتی حیرت سے اس کا منہ تکتی اور بولتی بھی کیا۔ رام داس کے سپنے اس کے پلے نہیں پڑتے تھے۔ وہ تو بس اتنا جانتی تھی کہ سرکاری ابھیان کے مطابق بچے کو پڑھانا ضروری ہے۔

رام داس کا بیٹا ٹھیک تھا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد وہ سخت بیمار ہو گیا۔ موت اس کی دہلیز پر دستک دینے لگی۔ مالتی نے رو رو کر برا حال کر لیا۔ رام داس نے اسے تسلی دی اور انہیں اپنے رکشا میں بٹھا کر قصبے کے سب سے بڑے ڈاکٹر آفاق احمد کے بنگلے کی طرف چل پڑا۔ آن کی آن میں ڈاکٹر آفاق کے بنگلے کے گیٹ پر پہنچ گیا۔ گھبراہٹ میں اس نے گھنٹی بجانے کے بجائے ڈاکٹر کو چلا کر آواز دی ''ڈاکٹر صاحب! دروازہ کھولیے۔'' آدھی رات کا وقت تھا، ہوا تیز چل رہی تھی۔

بارش کے آثار نظر آرہے تھے۔ چند لمحوں بعد اندر سے آواز آئی: ''کون ہے؟''

''میں ہوں رام داس رکشا والا۔ میرا بچہ سخت بیمار ہے۔ دروازہ کھولیے۔'' اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

پھاٹک کھلا، ڈاکٹر آفاق بڑا سا ٹارچ لیے نظر آئے۔ بجلی چلی گئی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب! میرے بچے کو بچا لیجیے۔'' مالتی نے روتے ہوئے کہا۔

''اندر آؤ!'' وہ انھیں اندر لے گئے۔ اندر روشنی تھی۔ انھوں نے بچے کا معائنہ کیا اور فوراً اسے ایک انجکشن لگایا۔ ''اسے فوراً ہسپتال لے جاؤ۔ اسے نمونیہ ہوگیا ہے۔ آکسیجن کی ضرورت پڑسکتی ہے۔'' پھر کچھ سوچ کر کہا۔'' اچھا ٹھہرو! میں ایمبولنس کے لیے فون کرتا ہوں۔'' لیکن بارش اور طوفان کی وجہ سے فون ڈیڈ تھا۔ ڈاکٹر آفاق سوچ میں پڑ گئے۔ کیس سیریس ہے اور ہسپتال دور اور مزید یہ کہ بارش بھی زوروں سے ہورہی تھی۔ رام داس اور مالتی ڈاکٹر آفاق کے چہرے پر فکرمندی کے آثار دیکھ کر اور بھی گھبرا گئے۔ مالتی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور رام داس بھی رو پڑا۔ شاید زندگی میں پہلی بار اس کی آنکھوں میں آنسو آئے تھے۔ اسے اپنا سپنا بکھرتا ہوا محسوس ہوا۔

''ڈاکٹر صاحب! میں نے زندگی میں بہت دکھ جھیلے ہیں۔ لیکن امر کی جدائی کا غم میں نہیں سہہ سکتا۔ امر مر گیا تو میرے سپنے مر جائیں گے۔ رام داس خاموش ہوگیا جیسے اس نے کچھ کہا ہی نہ ہو۔ لیکن اس کی آنکھیں بول رہی تھیں۔ ڈاکٹر آفاق اس کی باتوں سے بے حد متاثر ہوئے۔ گھبراؤ مت۔ تمہارا امر ٹھیک ہوجائے گا۔ اسے میں ہسپتال لے جاؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ اندر گئے۔ تیزی سے کپڑے تبدیل کرکے باہر آئے۔ انہوں نے امر کو ایک اور انجکشن لگایا۔ گیرج سے اپنی ماروتی نکالی اور تینوں کو لے کر ہسپتال کی طرف چل پڑے۔ گاڑی ہوا سے باتیں کررہی تھی۔ بارش تقریباً تھم گئی تھی۔ بوندا باندی ہورہی تھی۔ ہوا کا زور کم ہوگیا تھا۔ ماروتی ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوئی۔ امر کو فوراً ایمرجنسی وارڈ میں داخل کیا گیا۔ رام داس اور مالتی برآمدے میں انتظار کرنے لگے۔ رام داس تو بے چینی میں ٹہل رہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد ڈاکٹر آفاق ان کے پاس آئے۔ ''رام داس! تمھارا امر اب خطرے سے باہر ہے۔'' یہ سن کر رام داس اور اس کی بیوی پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ نے میرے بچے کو بچالیا۔ ہم آپ کا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ مالتی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور لہجے میں شکر و احسان نمایاں تھا۔

''ڈاکٹر صاحب! ہم آپ کی فیس نہیں دے سکتے۔'' رام داس نے بمشکل کہا۔ اس کی آواز بھر آئی تھی۔ زبان خاموش تھی لیکن آنکھیں اس کے جذبات کی عکاسی کررہی تھی۔

ڈاکٹر آفاق نے پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا: ''رام داس میں تمہارے جذبات کو سمجھتا ہوں۔ تم ایک خوددار آدمی ہو۔ میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔ یہ تو میرا فرض تھا۔ مجھے فیس نہیں تمہاری دعا چاہیے۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر آفاق چلے گئے رام داس کو سوچتا چھوڑ کر۔ وہ انھیں جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اسے ڈاکٹر آفاق میں اپنے بچے امر کے لیے دیکھے سپنوں کا عکس نظر آرہا تھا۔

■

Dr. Anwar Adeeb
Ibrahim Manzil, Mosaddi Mohalla
Railpar
P.O: Asansol- 713301

محمد طارق

پچھتاوا

پچاس روپے ٹیبل پر رکھے تھے۔ اس نے بغیر اپنے والدین کی اجازت کے ان کی نظریں بچا کر پچاس روپے کا نوٹ ٹیبل سے اٹھالیا اور اپنی قمیص کی جیب میں رکھ کر خاموش گھر سے نکل پڑا۔

پچاس روپے جیب میں آتے ہی اس کے دل کے دھڑکنے کا انداز بدل گیا اور سارے بدن میں ایسی تازگی آ گئی کہ اسے اپنے وجود کے ذی حیثیت ہونے کا شدت سے احساس ہونے لگا۔ کچھ کرنے کی تمنا اس کے دل میں مچلنے لگی۔

گھر سے نکل کر وہ کچھ دیر نکڑ پر کھڑا جانے کیا سوچتا رہا...

اور پھر اس کے قدم بازار کی طرف اٹھ گئے۔

بازار میں مختلف چیزوں سے سجی ہوئی دکانوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ ہر دکان پر دل لبھانے والے نت نئے اشتہارات آویزاں تھے___اشتہار۔ اشتہار، جیسے چیزیں نہیں اشتہارات کی خرید و فروخت کی دکانیں سجی ہیں۔ لوگ جیسے سامان نہیں لیبل خرید رہے ہیں۔

آج بازار میں اسے کافی چہل پہل اور رونق لگ رہی تھی۔ آج سے قبل وہ اپنے والد کے ہمراہ بارہا بازار گیا تھا مگر اسے بازار اتنا پرکشش کبھی نہیں لگا تھا۔ حالانکہ بازار ویسا ہی تھا سجی سنوری دکانوں والا۔ اشتہارات تک نہیں بدلے تھے۔ رونق اور چہل پہل حسبِ معمول تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ آج اس کی جیب میں پچاس روپے کا کرارا نوٹ تھا۔

نوٹ: کرارا ہو یا پرانا بوسیدہ، گرمی ایک سی رکھتا ہے۔

نوٹ: غریب کے پاس ہو یا امیر کے پاس، خواہشات کی تکمیل کو حوصلہ دیتا ہے۔

نوٹ: بوڑھے کے پاس ہو یا بچے کی جیب میں، اس کے ارمان پورے ہونے کے لیے مچل اٹھتے ہیں۔

بازار میں پہنچتے ہی اس کے ارمان مچلنے لگے۔ کھلونے لینے کا ارمان، ٹافیاں خریدنے کا ارمان بسکٹ کھانے کا ارمان، پچاس روپے میں یہ سارے ارمان تو پورے نہیں ہو سکتے! وہ سجی ہوئی دکانوں کے درمیان کھڑا سوچ رہا تھا۔ اس کا جی چاہ

رہا تھا کہ وہ ساری دکانیں خرید لے۔سارے بازار کا مالک بن جائے۔

پیسہ جیب میں آتے ہی ہوس کیسے بڑھ جاتی ہے۔ ارمان کتنے بے لگام ہوجاتے ہیں۔ وہ سوچ رہا تھا، کاش! میرے پاس بہت پیسے ہوتے بہت سارے،مگر میرے پاس تو صرف پچاس روپے ہیں۔کیا خریدوں میں پچاس روپے میں؟

بازار میں آنے سے قبل،نکڑ پر کھڑا ہوکر اس نے جو سوچا تھا وہی خیال پھر اس کے ذہن میں آیا اور ایک افسردہ مرجھایا ہوا چہرہ اس کے تصور کے پردے پر نمودار ہوا اور اس کے اندر دکانیں خریدنے، بازار کا مالک بن جانے کی ہوس نے دم توڑ دیا۔

وہ انتہائی وارفتگی کے عالم میں ایک دکان کا پائدان چڑھا اور پینتالیس روپے کی وہ چیز خریدی جس کی افسردہ چہرے والے کو ضرورت تھی اور پھر اس چیز کو قمیص کے نیچے پتلون کے بیلٹ میں پیٹھ کی طرف کھوسا اور پانچ روپے کا سکہ جیب میں رکھ کر گھر کی طرف چل پڑا اب اس کا دل ایک عجیب طرح کی مسرت سے بھرا ہوا تھا۔

جیسے ہی اس نے گھر میں قدم رکھا۔اس کے والد اولے برسانے والے بادل کی طرح اس پر گرجے ”ٹیبل پر رکھا ہوا پچاس روپے کا نوٹ کہاں ہے؟“

اس کی والدہ بھی کچن روم سے نکل کر آ گئی تھیں۔

”بیٹا کیا تم نے پچاس روپے لیے؟“

”ہاں——!“ اس نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

”بغیر اجازت——! یہ چوری ہے“ اس کے والد کا چہرہ غصے کی آگ میں تمتما رہا تھا۔

”کیوں چرائے تم نے پچاس روپے؟“

جواب میں وہ خاموش سر جھکائے کھڑا تھا۔

”بتاؤ! کیوں چرائے تم نے پچاس روپے؟“ ایک

زناٹے دار طمانچہ اس کے گال پر پڑا۔ وہ گر گیا۔

والدہ نے اسے اٹھایا ''بتاؤ! کس لیے تم نے پچاس روپے چرائے ہیں؟''

وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے اپنے والدین کو دیکھنے لگا۔ ''بتاؤ کس لیے تم نے چوری کی؟'' اس کے والد پھر گرجے۔

''وہ میں نے'' لڑکا سسک کر کہنے لگا ''میری کلاس میں ایک غریب لڑکا پڑھتا ہے۔ میں نے اس کے لیے کتاب خریدی، پینتالیس روپے کی۔ پانچ روپے بچے ہیں!''

لڑکے نے جیب سے پانچ روپے نکال کر والد کو دیا اور اپنی قمیص کے نیچے پیچھے کی طرف پتلون کے بیلٹ میں کھونسی ہوئی کتاب نکال کر والدین کے سامنے بڑھا دی، دوسرے طمانچے کے لیے اس کے والد کا اٹھا ہوا ہاتھ ہوا میں ہی رک گیا۔

والدہ نے بے اختیار آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ اس کے ماتھے کو چوما اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے کر بولیں ''بیٹا! تم نے یہ پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اگر تم ہم سے کہہ دیتے تو ہم انکار تھوڑی کرتے۔''

''ہاں امی مگر ہمارے سرؔ نے کہا تھا کہ کسی ضرورت مند اور محتاج کی مدد اس طرح کرو کہ ایک ہاتھ سے دو تو دوسرے ہاتھ کو خبر بھی نہ ہونے دو۔ اس لیے میں نے۔''

لڑکا بات ادھوری چھوڑ کر والدین کے چہرے کو تکنے لگا جو مسرت سے کھِل گئے تھے۔

''بیٹا! تم نے نیک کام کیا ہے۔ اگر تم ہم سے پوچھ لیتے تو ہم تمھیں منع نہیں کرتے۔'' والدہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔

''امی جان! نیک کام کے بارے میں کچھ بتایئے نا؟''

''بیٹا نیک کام تو بہت سے ہیں، بس ابھی تم اتنا سمجھ لو کہ وہ سارے کام جس کے کرنے میں کسی بھی قسم کا، خوف نہ ہو، خوشی ہو، مسرت سے دل بھر جاتا ہو اور جس کام کے کرنے میں اگر تکلیف بھی پہنچے تو کوئی رنج نہ ہو، ایسے سارے کام نیک کام ہی ہوتے ہیں بیٹا! ایک بات اور نیک کام صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے کیے جاتے ہیں۔'' والدہ بیٹے کو سمجھا رہی تھیں اور اس کے والد کرسی پر سر جھکائے بیٹھے رو رہے تھے۔

''آپ کیوں رو رہے ہیں جی! اپنے بیٹے نے کوئی غلط کام تھوڑی کیا ہے۔''

''میں اپنے بیٹے کے فعل پر نہیں رو رہا ہوں۔ اس لیے بھی نہیں رو رہا ہوں کہ میں نے اسے سزا کیوں دی بلکہ میں اس لیے رو رہا ہوں کہ بچپن میں میں نے بارہا اپنے والدین سے کبھی جھوٹ بول کر، کبھی آنکھوں میں دھول جھونک کر پیسے اڑائے۔ ان کی نافرمانیاں کیں، جس کے عوض اکثر میرے والدین نے مجھے مارا پیٹا— آج میں تقریباً چالیس سال کا ہو چکا ہوں۔ ایک سمجھدار، باشعور آدمی۔ آج تک مجھ سے نہ جانے کتنے گناہ ہو چکے ہیں اور وہ سارے جہاں کا مالک، جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ میرے وجود پر، میری ہر سانس پر جس کا پورا اختیار ہے۔ اس نے مجھے کبھی سزا نہیں دی۔ مجھے درگزر کرتا رہا۔ سچ مچ وہ میرے والدین سے زیادہ مجھ سے محبت کرنے والا ہے اور میں! اپنے بیٹے کی ایک غلطی کو برداشت نہ کر سکا اور وہ میرے گناہ'' اس کے والد اپنے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے...

■

Mohd Tarique
Inamdar House, Post: Kholapur
Distt.: Amravati- 444802 (Maharashtra)
Mob.: 8055503366

کہانی

سراج فاروقی

بہادر بچے

"بھیا... بھیا... اٹھ اٹھ.... دیکھ ... باپو کہاں جا رہے ہیں؟ ...ان کے ارادے خطرناک نظر آ رہے ہیں۔"

نیلو نے اپنے بھائی نندو کو اٹھایا۔

کل دن میں بینک کے کچھ کارندے آئے تھے۔ ان کو دھمکا کر گئے تھے۔

"قرض کی قسط ادا نہ ہوئی، تو انجام اچھا نہیں ہوگا..."

اسی سلسلے میں نیلو کے والدین میں صلاح و مشورہ ہوا۔ اس کی والدہ مائکہ چلی گئی کہ بھائیوں سے کچھ امداد مل جائے، تو قرض کی ادائیگی ہو جائے گی۔

رات میں وہ، نندو اور والد ہی گھر میں تھے۔ ٹینشن کی وجہ سے کسی نے کھانا بھی ٹھیک طرح سے نہیں کھایا تھا۔ رات کافی دیر تک جاگتے رہے تھے۔ گھر میں کھٹ پٹ کی آواز سن کر نیلو کی آنکھ کھل گئی۔ والد کو رسّی لے کر دبے پاؤں، گھر سے باہر جاتا دیکھ لیا۔ اسے حیرت ہوئی۔

پہلے بھی باپ گھر سے صبح جلدی جاتا تھا، لیکن ایسی صورت میں نہیں جاتا تھا۔ اسے فکر دامن گیر ہوئی۔ اس نے بھائی کو جگایا۔ نندو اس سے دو سال بڑا تھا۔ اس سے کسی قدر ہوشیار اور سمجھ دار بھی تھا۔

نندو آنکھیں ملتے اٹھ بیٹھا۔ دونوں آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے اور کنائے کیے اور گھر سے پھرتی کے ساتھ نکل پڑے۔

گاؤں سے باہر جا کر دیکھا۔ پو پھٹ رہی تھی، لیکن کسی کا آنا جانا ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ اب وہ کہاں جائیں والد کو تلاش کرنے؟ یہ سوال ان کے سامنے اہم تھا۔

تھوڑی دیر بعد، دونوں نے کنکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کھیتوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ کھیتوں کی چھوٹی بڑی پگڈنڈیوں سے گرتے پڑتے جب وہ اپنے کھیت پر پہنچے، تو ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ان کا والد پیڑ کی شاخ سے جھول رہا تھا۔ اس کے گلے میں پھندا لگا ہوا تھا۔ وہ چیخ کر بے تحاشہ اس کی طرف دوڑ پڑے۔

نندو نے جلدی سے ان کے پیروں کو اپنے کندھوں پر رکھ لیا اور کھڑے ہونے کی کوشش کرنے لگا، لیکن ناکام رہا۔ اس نے نیلو سے کہا، "تُو جلدی سے درخت پر جا کر پھندا کھول... میں باپو کو نیچے سے سنبھالتا ہوں.....!"

نیلو روتے، بلکتے، کانپتے اور ہانپتے پھندا کھولنے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ توازن بنا کر کھڑا ہونے کی پوری کوشش کرتا رہا کہ والد کے گلے کی پھانس ٹائٹ نہ ہو۔ اس تگ ودو میں کبھی وہ گر جاتا ہے۔ کبھی سنبھلتا بھی ہے۔ پھندے کی گانٹھ نیلو سے کبھی کھلتی بھی ہے اور کبھی کھلتے کھلتے رہ جاتی ہے۔

دونوں کی آنکھوں سے آنسو، گنگا کی دھارا کی طرح بہے جارہے ہیں۔ ہاتھ پاؤں پھولے جارہے ہیں اور پسینہ ہے کہ جسم کے ہر حصے سے پھوٹا جارہا ہے۔ ان کے سامنے سوال سر ابھارے کھڑا ہے کہ ”اب کیا ہوگا؟ باپ کو وہ بچا بھی پائیں گے یا نہیں؟“ کبھی وہ گھبرا کر مدد کے لیے آواز بھی لگا لیتے ہیں۔ ادھر اُدھر اس امید پر دیکھ بھی لیتے ہیں کہ کوئی شخص دکھائی دے جائے تو مدد کو بلا لیں، مگر سوئے اتفاق! کوئی نظر آتا ہی نہ تھا۔

کبھی وہ سوچتے۔ دوڑ کر کسی کو بلا لائیں، لیکن انھیں خوف آتا کہ جب تک وہ کسی کو بلانے جائیں گے۔ ان کے والد بھگوان کو پیارے ہو جائیں گے۔ ابھی زندہ ہیں۔ بے ہوش ہیں۔ شاید بچ جائیں۔ اسی دھن اور کوشش میں روتے، بلکتے، ہانپتے اور کانپتے کوشش کیے جاتے ہیں۔ نیچے سے والد کا بار اٹھا کر نندو نے زور سے کہا، ”کھول... کھول... جلدی کھول...“

درخت سے نیلو سسکتے ہوئے بولی، ”کھول تو رہی ہوں... ہاں تھوڑا اور... تھوڑا اور اٹھاؤ...!“

نندو نیچے سے مزید زور لگاتا ہے۔ کہاں وہ بارہ تیرہ سال کا لڑکا۔ بیس پچیس کلو وزن اور کہاں ساٹھ ستر کلو کا باپ؟ اٹھتا ہے کیا؟ وہ بھی ایسی حالت میں۔ جہاں خوف اور نقاہت دونوں ایک ساتھ کام کر رہے ہوں۔

وہ پسینے سے شرابور طاقت لگائے جاتا ہے اور دعائیں کیے جاتا ہے۔

”اے بھگوان! میرے بابو کو بچالو...!“

اس نے کلکلا کر اپنی بساط سے بھی زیادہ زور لگا دیا۔ ایک جنون۔ ایک جذبہ عود کر آیا تھا اس میں۔ آنکھیں باہر اُبلی پڑتی تھیں۔ چہرہ سرخ ہوا جاتا تھا۔ جبڑے تن گئے تھے۔ سارے اعضا مشتعل تھے۔ وہ زور سے چلّایا، ”لے کھول... کھول... جلدی کھول...!“ اس بار لگ بھگ وہ والد کا بار لے کر کھڑا ہو گیا تھا۔ پاؤں سرکنڈے کی مانند لرز رہے تھے۔ منہ اور ناک سے ہوا طوفانی رفتار سے آ اور جارہی تھی۔ دم نکلنے کو ہو رہا تھا کہ نیلو نے گانٹھ ڈھیلی کر دی۔ وہ وقت بھی آیا۔ جب جد و جہد رنگ لائی اور وہ والد کو لیے دیے زمین پر آرہا تھا۔

نیلو جلدی سے گلہری کی مانند نیچے کود گئی۔ والد کی پیشانی کو چھوا۔ سینے سے کان لگایا۔ اس نے محسوس کیا۔ والد ابھی زندہ ہیں۔ جلدی سے وہ ادھر اُدھر نظریں دوڑائی۔ اسے ایک درخت کے پاس ٹوٹی ہانڈی نظر آگئی۔ اس نے جلدی سے اس ہانڈی کو اٹھایا۔ تالاب کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہاں سے ہانڈی میں پانی بھرا۔ جلدی سے آکر باپ کے منہ پر چھپاکے مارنا شروع کر دی۔ ہتھیلی اور تلوے تر کرنے لگی۔

اب تک نندو بھی سنبھل چکا تھا۔ پانی کے چھپاکے مار مار کر دونوں بچے روتے بلکتے بابو کو ہلا ڈُلا رہے تھے۔ گریہ و زاری کرتے دونوں بھگوان سے ان کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔

بھگوان کو جیسے، ان معصوموں پر ترس آگیا۔ ان کی دعائیں قبول ہو گئی تھیں۔ باپ نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ اپنے سامنے بچوں کو روتا، بلکتا پا کر اٹھ بیٹھا اور ”میرے بچو!“ کہہ کر ان کو بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

بچوں نے روتے بلکتے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا، ”بابو! آپ ہم سب کو چھوڑ کر جارہے تھے... سوچا بھی نہیں... ہمارا کیا ہوگا...؟“

"مجھ سے بڑی بھول ہوگئی بچو!... مجھے معاف کردو...!" والد نے سسکتے ہوئے کہا۔

نندو نے آنسوؤں کو ہتھیلی سے پونچھتے ہوئے کہا، "باپو! آپ فکر نہ کریں۔ آپ کا سارا قرضہ میں بھروں گا...!"

نیلو بھی سینہ تان کر کھڑی ہوگئی، "باپو! میں بھی....!"

"بچو! میں نے خود کو تنہا سمجھ لیا تھا۔ اس لیے میں نے ایسا قدم اٹھالیا۔ تمھیں سچ بتاؤں۔ جب گلے میں پھانسی کا پھندا لگ گیا، تو مجھے احساس ہوا۔ خودکشی سمسیا کا حل نہیں۔ بلکہ یہ تو خود ایک سمسیا ہے... میں اب ایسا کبھی کچھ نہ کروں گا۔ میرے پیارے بچو! مجھے معاف کردو...!"

بچے باپ سے چمٹ گئے تھے۔

"سمسیائیں سب کے اوپر آتی ہیں۔ کیا کوئی ایسے مرجاتا ہے۔ یہ بزدلوں کا کام ہے۔ ہم بہادر بنیں گے اور سمسیا کا سمادھان کریں گے...!" باپ نے کہا۔

"ہاں باپو......!" دونوں بچوں نے اشکوں کو پونچھتے ہوئے ہنسنے کی ناکام کوشش کی۔

باپ نے اپنے دونوں بچوں کو شفقت و محبت سے ایک بار پھر سینے سے بھینچ لیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ پیچھے سے سورج طلوع ہو رہا تھا۔ اس کی نرم و نازک اور رنگین شعائیں ان کی پشتوں پر پڑ رہی تھیں۔ گویا ان کی پشتوں کو تھپتھپا کر انھیں خوش آئند زندگی کا آشیرواد دے رہی ہوں۔

■

Siraj Farooqui
703-Wadghar,Panvel-410206
Dist-Raigad, Navi Mumbai (Maharashtra)
E-mail:sirajf69@gmail.com
Mob.: 08108894969

Subscription Form "Bachon Ki Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'بچوں کی دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................................. بتاریخ..

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/100 روپے 90092010045326 :A/C، IFSC: CNRB0019009

میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'بچوں کی دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, Email.: magazines@ncpul.in

دستخط

عادل حیات

چودھری کاکا

وہ کسان کی بیٹی تھی۔ ایک ایسا کسان جو کھیتی باڑی کر کے مشکل بھری زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کے والد بھی اپنی تھوڑی سی زمین پر کھیتی باڑی کر کے پریوار کا پیٹ پالتے تھے۔ انھوں نے اپنے بچوں کی پڑھائی لکھائی پر خاص دھیان دیا۔ ان کی حیات میں ہی بڑی بیٹی سیما مڈل اسکول کی طالبہ تھی۔ والد کے انتقال کے بعد بھی اس نے پڑھائی نہیں چھوڑی۔ امی سلائی کڑھائی کرتیں۔ جو پیسے آتے، ان سے گھر کا خرچ بھی چلتا اور وہ اپنے بچوں کو پڑھنے کے لیے اسکول بھی بھیجتیں۔ ابو کے جگری دوست چودھری ہربھجن سنگھ گاہے بہ گاہے ان کی مدد کرتے۔ اس کے باوجود سیما کی پڑھائی گاؤں کے دوسرے بچوں کی طرح نہیں ہوسکی، لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔ اس نے گاؤں کے اسکول سے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے دہلی چلی گئی۔ اس نے دہلی یونیورسٹی کے ایک کالج سے بی اے امتیازی نمبروں کے ساتھ کیا تو اسے ولایت میں پڑھنے کے لیے اسکالرشپ سے نوازا گیا۔ اسکالرشپ ولایت میں پڑھنے، وہاں رہنے اور کھانے پینے کے لیے تھی۔ اس میں ہوائی جہاز کا کرایہ شامل نہیں تھا۔ وہ کرائے کا انتظام کرنے کے لیے گاؤں گئی۔ اسے دیکھ کر امی بہت خوش ہوئیں۔ تھوڑا وقت گھر میں گزارنے کے بعد چودھری کاکا کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے کھیت میں گیہوں کاٹ رہے ہیں۔ وہ سیدھے چودھری کاکا کے پاس کھیت میں پہنچی۔ اس وقت چودھری ہربھجن سنگھ گیہوں کی فصل کاٹنے میں مصروف تھے۔ دھوپ کی تمازت گرمی کو بڑھائے ہوئے تھی۔ چودھری کاکا کے بدن پر دھوتی کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ وہ پسینے میں نہائے ہوئے تھے۔ سیما چپکے سے قریب گئی اور کانوں کے پاس منہ لے جاکر دھیرے سے کہا:

''چودھری کاکا۔''

چودھری ہربھجن سنگھ نے اپنی گردن گھما کر دیکھا۔ سیما ان کے پیچھے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور حیرت و تعجب بھرے لہجے میں پوچھا:

''بٹیا!..... کب آئی..... پڑھائی لکھائی کیسی چل رہی ہے۔''

''اچھی چل رہی ہے کاکا..... ابھی آئی ہوں..... امی نے کہا کہ آپ کھیت میں گیہوں کاٹ رہے ہیں..... میں آپ سے ملنے سیدھے کھیت چلی آئی۔''

سیما نے ایک ہی سانس میں اپنی باتیں پوری کیں۔ دونوں کھیت میں رکھے گیہوں کے بوجھے پر بیٹھے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ دن کافی چڑھ گیا تو چودھری ہربھجن سنگھ نے سیما سے کہا:

''بٹیا!..... گرمی بہت ہے، کہیں لُو نہ لگ جائے..... اس لیے گھر جاکر آرام کرو۔ شام میں بات کریں گے۔''

سیما دہلی سے ایک مقصد لے کر گاؤں چودھری کا کا سے ملنے آئی تھی۔ اس نے چاروں طرف نظریں گھمائیں، دور تک کوئی نہیں تھا۔ اس نے سوچا موقع اچھا ہے، اسی وقت چودھری کا کا سے ولایت جانے والی بات کہہ دینی چاہیے۔ اس نے چودھری کا کا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"کا کا..... میں پڑھنے ولایت جا رہی ہوں۔"

"بٹیا!..... پڑھ لکھ کر کیا کروگی۔"

چودھری ہربجن نے معصومیت سے پوچھا تو سیما مسکرانے لگی۔ اس نے چودھری کا کا کے ہاتھوں کو تھام لیا اور کہنے لگی:

"پڑھ لکھ بڑی افسر بن جاؤں گی اور واپس گاؤں آ کر آپ کے سپنے سا کار کروں گی۔"

"تو پھر ٹھیک ہے ..... بٹیا! جی جان لگا کر پڑھائی کرو ..... کوئی دقت آئے تو مجھ سے کہنا۔"

سیما کو یہ موقع بہت ہی مناسب معلوم ہوا۔ اس نے اپنے مطلب کی بات کرتے ہوئے بولی:

"کا کا! ..... ولایت میں پڑھائی لکھائی اور رہنا سہنا تو فری ہے، لیکن وہاں جانے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔"

"ارے بٹیا! ..... ہم ہیں تو پیسے کی چنتا کیسی۔"

وہ ہوائی جہاز میں بیٹھی چودھری کا کا کے بارے میں سوچ رہی تھی اور ذہن کے پردے پر ان سے جڑی ہوئی فلم سی چل رہی تھی۔ چودھری کا کا اپنی دھوتی باندھے پسینے سے شرابور گیہوں کاٹ رہے ہوں گے۔ ان کا پسینہ ننگے بدن سے گزرتا ہوا ٹپ ٹپ زمین پر گرتا ہوگا اور میں ہوائی جہاز میں بیٹھی ولایت کا سفر کر رہی ہوں۔ یہی سب کچھ سوچتے سوچتے منزل آ گئی۔ وہ ائیر پورٹ سے باہر نکلی اور سیدھے اپنے ہاسٹل کا رخ کیا۔ ہاسٹل کے اے سی روم میں گرم گرم چائے کی چسکی لیتے ہوئے بھی چودھری کا کا کی یاد آئی۔ دوسرے دن اپنے ہاسٹل سے نکل کر سومسکو پہنچی تو راستے میں خوبصورت لال قالین بچھے ہوئے دیکھا۔ اس قالین پر چلتے ہوئے بھی چودھری کا کا دھوتی پہنے ایک خاص انداز میں گیہوں کاٹتے ہوئے آنکھوں کے پردوں پر متحرک ہو گئے۔

اس کا ایڈمیشن پیرس انٹرنیشنل یونیورسٹی میں پہلے ہی ہو چکا تھا۔ وہ اپنی پڑھائی میں جُٹ گئی۔ وہاں بھی اعلیٰ نمبروں کے ساتھ کامیابی حاصل کی اور اسکالرشپ لے کر آکسفورڈ یونیورسٹی پڑھنے کے لیے چلی گئی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے نوکری کرنے کا فیصلہ کیا اور یو این او کے انڈونیشیا برانچ میں کام کرنے لگی۔ وہاں کچھ وقت گزارنے کے بعد نیویارک چلی گئی اور وہاں اعلیٰ عہدے پر فائز ہو گئی۔ وہ کثیر منزلہ عمارت کے بیالیسویں مالے پر ایک خوبصورت کمرے میں رہتی تھی۔ اس کمرے کی دیواریں شیشے کی تھیں۔ رات کے وقت وہاں کا ٹمپریچر منفی تیرہ ڈگری ہو جاتا تھا۔ ایک دن بہت تیز برف باری ہو رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑی کافی کی چسکی لیتے ہوئے باہر کا نظارہ دیکھ رہی تھی۔ اس کی دو انگلیاں کپ کے نیچے خاص انداز میں تھیں۔ سڑک سے ماچس کی ڈبی کے جیسی پیلی ٹیکسیاں زناٹے کے ساتھ گزر رہی تھیں۔ سڑک کی دوسری طرف امپائر اسٹیٹ بلڈنگ تھی۔ اس بلڈنگ میں ہر مہینے جشن ہوتا اور ہر جشن کا رنگ بدل جاتا تھا۔ اس دن کے جشن کا رنگ کیسریا ہرا تھا۔ وہ امپائر اسٹیٹ بلڈنگ کے بدلتے رنگ کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ میں نے پیرس اور آکسفورڈ میں پڑھنے کے بعد اچھی اچھی نوکری پائی۔ میں نے کئی ممالک کی سیر بھی کی ہے، لیکن چودھری کا کا اور دوسرے لوگ جنہوں نے مجھے پڑھا لکھا کر اس قابل بنایا، وہ امس بھری گرمی میں بنا بجلی اور پانی کے زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔ اس نے اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا کہ گرمی کی چھٹی میں گاؤں

گئی ہوئی ہے۔ اسے دیکھ کر گاؤں کے لوگوں کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوگئی، جیسے ان کی آنکھوں میں ستارے چمک رہے ہوں۔ انہیں لگتا تھا کہ بٹیا ولایت میں پڑھ لکھ کر ان کی زندگی میں ایک بڑا انقلاب لا دے گی۔ ان میں ایسے بھی لوگ تھے جو اس کے بیٹی ہونے پر طعنے بھی دیتے تھے:

"لونڈیا ہے ..... ولایت میں پڑھنے کے بعد بھی کیا کر لے گی .... اگر لونڈا ہوتا تو کوئی بات بھی تھی۔"

اس طرح کے کئی اور جملے ماں کو سننے پڑتے۔ وہ ان جملوں کو ایک کان سے سنتی اور دوسرے کان سے نکال دیتی تھی۔ اسے یاد آیا کہ اس نے نیویارک سے جب کبھی امی کو فون کر کے پوچھا:

"امی! ..... انسولین کا انجکشن ریفریجریٹر میں رکھا کہ نہیں۔"

تو ماں کا ہمیشہ ایک ہی جواب ہوتا:

بٹیا! .... بالٹی میں برف کے ساتھ رکھ دیا ہے۔"

اسے یاد آیا کہ اس کے گاؤں میں بجلی تو ہے نہیں اور بجلی نہیں ہے تو ریفریجریٹر کس چیز سے چلے گا۔ اسے اپنے سوال پر خود ہی ہنسی آگئی اور وہ جھینپتے ہوئے چائے کے لمبے لمبے گھونٹ گلے سے اتارنے لگی۔ اسے اپنا بان کا پلنگ یاد آیا۔ جس پر بیٹھ کر مٹی کے تیل کے دیے کی روشنی میں پڑھا کرتی تھی۔ کبھی مٹی کا تیل ختم ہو جاتا تو موم بتیاں جلا لیتی تھی۔ آج بھی پلنگ پر موم بتیوں کے نشان موجود ہیں۔ وہ سوچتی رہی اور گاؤں کی یادیں ایک فلم کی طرح اس کے ذہن کے پردوں پر چلتی رہی۔

اچانک اسے گاندھی جی کا قول یاد آیا:

"کسی کشمکش کے حالات میں گرفتار ہو جاؤ تو نچلے طبقے کے کسی شخص کا خیال کرو ..... کسی لائن میں کھڑے آخری آدمی کے آنسو کو پوچھنے کی کوشش کرو ..... ایسا کرنے سے اس شخص کی زندگی میں بدلاؤ آجائے گا۔"

اسی وقت سیما نے ایک فیصلہ کیا۔ اپنے گاؤں، اپنے وطن جانے کا فیصلہ۔ دوسرے دن نوکری سے استعفیٰ دیا اور پہلی فلائٹ سے واپس اپنے وطن آگئی۔ یہاں آکر اس نے مختلف جگہوں پر نوکری کے لیے درخواست دیا اور سول سروس سیوا کی نوکری سے منسلک ہوگئی۔ اس نے اپنے گاؤں کا ہی نہیں بلکہ اپنی سروس کے دوران جہاں بھی گئی وہاں کی بنیادی ضرورتوں کے تحت سب سے پہلے بجلی اور پانی کا انتظام کیا، سڑکیں بنوائیں، اسکول بنوائے اور اسپتال کی بنیادیں رکھیں۔ اس کے علاوہ گاؤں کی چھوٹی چھوٹی دوسری پریشانیوں کو حل کرنے میں اپنا بھرپور تعاون دیا۔ اس کی کوششوں سے انسولین کا انجکشن امی بالٹی میں برف کے ساتھ نہیں بلکہ ریفریجریٹر میں رکھتی ہیں۔ چودھری ہربھجن سنگھ گیہوں کی فصل کاٹنے کے بعد بجلی کے پنکھے کے نیچے آرام کرتے ہیں۔ گاؤں کی عورتوں کو پانی لانے کے لیے سڑکیں ناپنی نہیں پڑتیں۔ روزانہ صبح اسکول جاتے ہوئے بچوں کو دیکھ کر اس کے والدین خوش ہوتے ہیں۔ کوئی بیمار راستے میں ہی دم نہیں توڑتا بلکہ گاؤں میں بنے اسپتال ہی میں اس کا معقول علاج ہو جاتا ہے۔

سیما کے پڑھے لکھے ہونے کا فائدہ سبھی اٹھا رہے ہیں۔ امی تو خوش ہیں ہی، چودھری ہربھجن سنگھ بھی پھولے نہیں سماتے۔ ان لوگوں کی زبان بھی بند ہوگئی ہے جو یہ کہتے نہیں تھکتے تھے:

"لونڈیا ہے ..... ولایت میں پڑھنے کے بعد بھی کیا کر لے گی .... اگر لونڈا ہوتا تو کوئی بات بھی تھی۔"

■

Adil Hayat
S-11/11, 2nd Floor
Neat-Riyan Pubalic School
Jogabai Extention, Jamia Nagar
New Delhi - 110025

ادھورا سبق

سید اسرار الحق سبیلی

شحیم میاں پڑھنے کے زمانے میں تو شریر تھے ہی، پڑھانے کے زمانے میں بھی ان کی شرارت نہیں گئی۔ وہ اپنے ساتھی معلمین کے ساتھ شرارت کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔ اتفاق سے ان کے ساتھی معلمین میں جاوید میاں بھی شامل ہوگئے جوان کے ہم جماعت اور جگری دوست تھے۔ اس طرح شحیم میاں کو ہنسی مذاق کا اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔

کچھ دنوں کے بعد عظیم صاحب کا تقرر بھی شمیم میاں کے مدرسہ میں ہوا، اور ان کو رہائش کے لیے شمیم میاں کے کمرے میں جگہ دی گئی، چونکہ عظیم صاحب نئے نئے تھے اور زیادہ تر اپنے کمرے میں فارغ رہتے تھے، اب تک ان کو ٹیوشن پڑھانے کے لیے کوئی جگہ نہیں ملی تھی۔ شحیم میاں اپنے کمرے میں انگریزی اخبارات و رسائل میں مصروف رہتے تھے۔ عظیم صاحب کو فرصت میں پاکر شحیم میاں نے عظیم صاحب کو اپنا شاگرد بنانا چاہا۔ شحیم میاں اچھی انگریزی جانتے تھے، ان کے مراسلے اور مضامین اخبارات و رسائل میں چھپا کرتے تھے، جب کہ عظیم صاحب کو انگریزی بالکل نہیں آتی تھی۔

شحیم میاں نے عظیم صاحب کے سامنے انگریزی زبان کی خوبیاں اور فائدے بیان کرنے شروع کردیے اور ان کو اپنا شاگرد بننے اور انگریزی پڑھنے پر آمادہ کرلیا۔ چنانچہ فیس طے کرلی گئی اور انگریزی ریڈر کا ایک سبق پڑھا دیا۔ سبق پڑھانے کے بعد شحیم میاں بولے: ''اگر میری تھوڑی جسمانی خدمت کردیں تو فیس میں کمی ہوسکتی ہے، اور پھر ان کو سوچنے کا موقع دیے بغیر پیٹھ دبانے کی خواہش کا اظہار بھی کردیا۔''

بے چارے عظیم صاحب مروت میں آ کر اپنے بالکل نئے اور نوخیز استاد کی پیٹھ دبانے لگے۔ پیٹھ دبا کر فارغ ہونے کے بعد عظیم صاحب کو احساس ہوا کہ اپنے سے کم عمر ہم پیشہ کا

روزانہ پیٹھ دبانا اچھا نہیں ہے۔ اس لیے انھوں نے صاف انکار کر دیا کہ میں مکمل فیس ادا کروں گا۔ فیس میں کٹوتی کے بدلے جسمانی خدمت نہیں کروں گا۔

شمیم میاں کو دوسری شرارت سوجھی۔ انھوں نے اپنے پرانے ساتھی جاوید کو بھی انگریزی پڑھنے کی ترغیب دینی شروع کی اور اس کے سامنے انگریزی پڑھنے کے فائدے بیان کیے۔ شمیم میاں کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر جاوید بھی انگریزی پڑھنے کو تیار ہو گئے۔ اس طرح یک نہ شد دو شد کے مصداق شمیم میاں کو انگریزی پڑھانے کے لیے دو شاگرد میسر آ گئے تھے۔ شمیم میاں نے دونوں سے فیس طے کی، اور ایک دو دن اچھے سے پڑھانے کے بعد فیس پیشگی ادا کرنے کو کہا۔ دونوں لائق شاگردوں نے پیشگی فیس ادا کر دی۔ شمیم میاں نے فیس کے پیسوں سے ایک عدد اچھی سی بالٹی خرید کر لی۔

دونوں شاگردوں کو پڑھانے کا وقت ظہرانہ کے بعد تھا۔ ظہرانہ کے بعد عموماً آرام کی خواہش ہوتی ہے۔ چھ پیریڈ پڑھانے کے بعد شمیم میاں تھک جاتے اور مدرسہ سے آتے ہی اپنے کمرہ میں چادر اوڑھ کر بستر پر دراز ہو جاتے، اور اپنے شاگردوں کو لیٹے لیٹے پڑھاتے۔ جب نیند کا غلبہ ہوتا تو شاگردوں کو کل کے وعدہ پر چھٹی دے دیتے۔ خاص طور پر جب دوپہر میں شامی کباب یا مرغ کا قورمہ ہوتا تو استاد صاحب خوب بھر پیٹ تناول فرماتے، اس دن ان کو پڑھاتے ہوئے جلد ہی نیند آ جاتی۔ ان کے پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ وہ شاگردوں سے عبارت خوانی (ریڈنگ) کراتے اور زبانی لیٹے لیٹے آنکھیں بند کر کے پڑھاتے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ ادھر شاگرد عبارت خوانی کر رہے ہیں، ادھر استاد گہری نیند میں چلے جاتے اور شاگردوں کو مجبوراً سبق ادھورا چھوڑ کر اٹھ جانا پڑتا۔

ایک ہفتہ تک یہی سلسلہ رہا۔ جب روز کا معمول ہو گیا کہ استاد پڑھاتے کم اور سوتے زیادہ ہیں، تو شاگردوں نے احتجاج کرنا شروع کر دیا کہ ہم اس طرح نہیں پڑھیں گے یا تو ہمیں اچھی طرح پڑھایا جائے یا ہماری فیس واپس کی جائے۔ استاد نے کہا ”فیس واپس ہونی تو مشکل ہے، کیونکہ فیس کی رقم سے میں نے بالٹی خرید لی ہے۔ ایسا کیجیے یہ بالٹی آدھی آدھی کاٹ کر اپنے ساتھ لے جائیے۔“ شاگردوں نے کہا ”ہم آدھی کٹی ہوئی بالٹی لے کر کیا کریں گے؟ ہمیں ہماری فیس کے پیسے واپس کیجیے۔“ استاد نے صاف انکار کر دیا کہ فیس کے پیسے تو بالٹی میں لگ گئے۔ فیس کی جگہ پر اب بالٹی ہے۔ اگر لینا چاہیں تو وہی لے لیں۔ اس طرح شاگردوں کا نقصان ہو گیا۔ نہ تو انھیں انگریزی کی تعلیم حاصل ہوئی اور نہ ہی فیس کے پیسے واپس ملے۔ استاد نے اپنے شاگردوں کو اچھا بیوقوف بنایا۔

میں نے شمیم میاں سے تنہائی میں پوچھا: ایسا تم نے کیوں کیا؟ بیچاروں کا نقصان کر دیا۔ تمھاری انگریزی تو بہت اچھی ہے۔ اپنے دوستوں کو انگریزی سکھانا چاہیے تھا۔ شمیم میاں نے مسکرا کر دلچسپ جواب دیا ”اسرار! تم بھی کیسی بات کرتے ہو، بھلا ساتھیوں کو تعلیم دی جا سکتی ہے۔ وہ تو خود اساتذہ ہیں اور ہمارے ساتھ بچوں کو پڑھاتے ہیں۔“ ”تو پھر انگریزی پڑھانے کا آفر تو تم نے ہی کیا تھا۔“ میں نے کہا۔ شمیم میاں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”میں تو اپنے ساتھیوں سے مذاق کر رہا تھا۔ ان کی غلطی ہے کہ انھوں نے میرے مذاق کو سنجیدگی سے لیا۔“

■

Dr. Syed Asrarul Haque
Asst. Professor, Depf of Urdu
Govt. Degree College Tandur
Vikarabad, Distt- 501141 (Telangana)
Mob.: 9346651710

کہانی

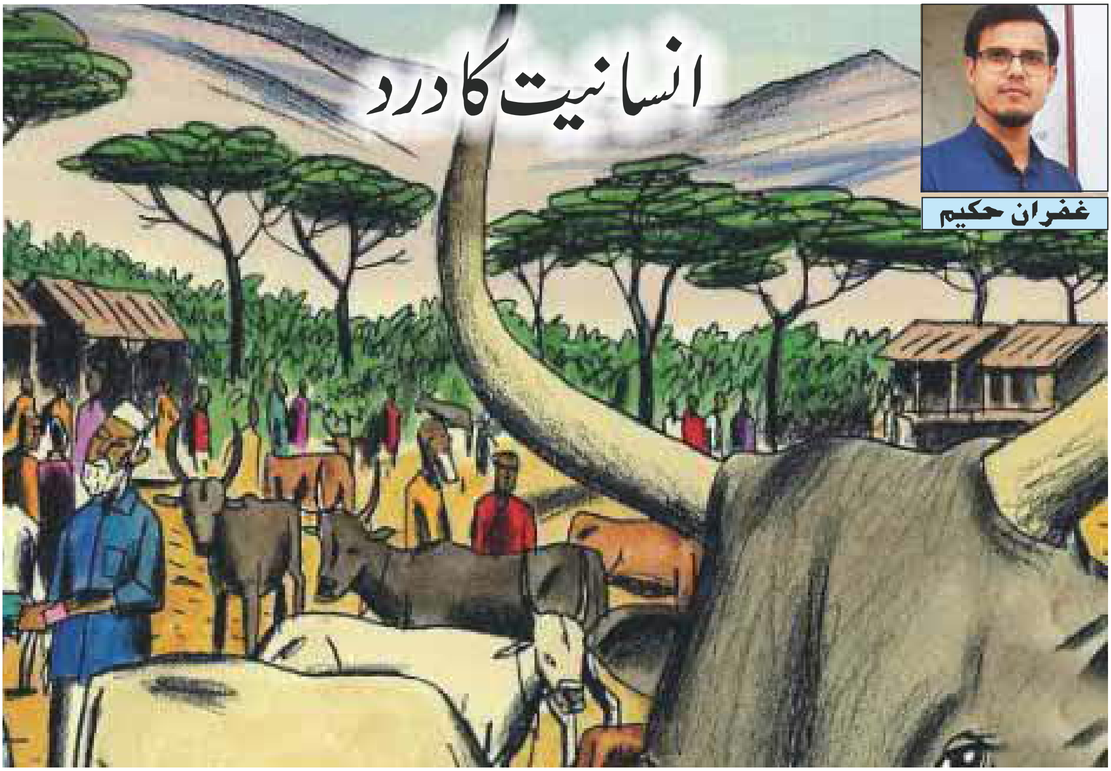

انسانیت کا درد

غفران حکیم

دسمبر کی ٹھٹھرتی ہوئی ایک صبح تھی۔ کئی روز سے سورج آسمان میں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ چرند و پرند اپنے اپنے آشیانوں میں دبکے بیٹھے تھے۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ کبھی کبھار کوئی شخص دکھائی دے جاتا تو یہ سمجھتے دیر نہ لگتی کہ وہ شخص یقیناً کسی اہم اور ضروری کام سے باہر نکلا ہے۔ وگرنہ ہر آدمی رضائیوں، کمبلوں اور گرم کپڑوں میں لپٹا ہوا نظر آ رہا تھا۔ گھروں میں جتنے بھی گرم کپڑے تھے سب استعمال میں آ چکے تھے۔

میں ناشتہ کرنے کے بعد گرم کپڑوں میں ملبوس ہونے کے باوجود اپنے اوپر دو موٹے موٹے کمبل ڈالے ہوئے گھر کی باہری کوٹھری میں بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے گھر کے جانور بندھے ہوئے تھے۔ ان میں بیل بھی تھے، گائیں بھی تھیں اور کئی بھینسیں بھی۔ ان میں سے کچھ بھیسوں کا گرم گرم دودھ ابھی میں نے گلاس بھر کر پیا تھا، جس کی مٹھاس اور تازگی ابھی تک حلق میں محسوس کر رہا تھا۔

سارے جانور جگالی کر رہے تھے گویا کچھ کھا رہے ہوں۔ مجھے ایسا لگا کہ اس طرح وہ بے زبان اس کڑاکے کی ٹھنڈ میں گرمی کا احساس کرتے ہوں گے۔ چند جانور سوکھے بھوسے پر منہ مار رہے تھے۔ ان بے زبان مخلوقوں کو میں بڑی غور سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یا اللہ یہ بھی تو جاندار ہیں کیا انھیں اس جان لیوا سردی کا احساس نہیں ہوتا؟ ایسی ٹھنڈ میں کہ جس کی شدت سے ہڈیاں تک کانپ رہی ہیں، یہ جانور اپنے آپ میں مگن ہیں۔ کوئی چارا کھا رہا ہے، کوئی جگالی کر رہا ہے، کوئی ایک دوسرے کو سینگ مار رہا ہے۔ گویا ان پر اس کپکپاتی سردی کا اثر نام کو بھی نہیں۔ تاہم میری نظروں نے دیکھا کہ کئی بھینسوں کے بال کھڑے ہیں جس سے بلاشبہ یہ ظاہر ہوتا تھا کہ سردی کی قیامت ان حیوانوں پر بھی ٹوٹی ہے۔

میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ان جانوروں کے جسم کو قدرت نے کس قدر مضبوط اور توانا بنایا ہے کہ انھیں کڑکڑاتی سردی کا کوئی احساس نہیں ہوتا اور پھر انسان اور چوپایوں کا باہم موازنہ کرنے لگا تھا کہ اچانک سامنے دروازے پر ایک حیرت انگیز منظر دیکھ کر میں دم بخود رہ گیا۔

کیا دیکھتا ہوں کہ کبھی کبھار میرے گھر پر آنے والا ایک شخص (وہ ہمارے کھیتوں میں کام بھی کرتا تھا) جس کو سبھی بھولا کہہ کر پکارتے تھے؛ جسم کے اوپری حصے پر محض ایک بنیان پہنے اور کمر سے ایک دھوتی لپیٹے ہوئے کھڑا ہے اور پڑوسیوں سے مسکرا مسکرا کر باتیں بھی کیے جا رہا ہے!!

اس کو اس حالت میں دیکھ کر بخدا میرے جسم میں سہرن سی دوڑ گئی۔ اب تک سرد ہوا کے جھونکے میرے جسم کو لرزا نہ سکے تھے مگر اس شخص کو دیکھ کر میری ہڈیاں تک لرز گئیں۔ کیونکہ اس کا نیم برہنہ جسم ایسی خطرناک سردی میں بھی صحت مند معلوم ہو رہا تھا، جو میرے لیے کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ اسے دیکھ کر میری آواز گویا حلق میں ہی گم ہو گئی۔

ٹھنڈ نہ لگنے یا سردی محسوس نہ ہونے کا سبب میں اس سے پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ عین اسی وقت میری امی مجھے گرم گرم چائے دینے کے لیے کوٹھری میں آ پہنچیں۔

چائے کی پیالی تھماتے ہوئے جیسے ہی ان کی نظر اس آدمی کی طرف گئی، وہ تقریباً چیختے ہوئے بولیں

”بھولو!! تم؟ اور اس حال میں؟“

عموماً ایسے حالات میں عورتیں بڑی نرم دل ثابت ہوتی ہیں۔ بہرحال امی بڑی تیزی سے کچھ بڑبڑاتے ہوئے گھر کے اندر گئیں اور تیز قدموں سے واپس لوٹیں، تو ان کے ہاتھ میں وہ سویٹر تھا جسے دو روز قبل میرے ابا بازار سے میرے لیے خرید لائے تھے اور میں نے اسے سائز میں بڑا ہو جانے کے سبب اٹھا کر گھر کے کسی کونے میں تقریباً پھینک دیا تھا۔ وہی سویٹر بھولا کو تھماتے ہوئے جلدی سے امی نے کہا:

”جلدی سے اسے پہن لو۔ بھلا ایسی ٹھنڈ میں کوئی اس طرح باہر نکلتا ہے؟“

بھولا ایک لمحے کے لیے جھجکا مگر پھر فوراً ہی اسے پہننے لگا۔ میں نے دیکھا کہ سویٹر پہنتے ہوئے اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔

سویٹر پہننے کے بعد اس نے ایک لمبی سانس لی اور بولا:

”بھابی جی! اگر میرے پاس اور کوئی کپڑا ہوتا تو میں ضرور پہنتا؛ اب آپ نے یہ سویٹر دے دیا ہے تو میں ضرور پہنا کروں گا۔“

بھولا کے جسم پر سویٹر کے پہنچتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا گویا میری نس نس میں گرمی کی لہر دوڑ گئی ہو۔

ایک بار پھر میں تخیل کی دنیا میں گم ہو گیا۔ اور دل ہی دل میں گویا ہوا کہ یا خدا! وہ جانور تو میرے اپنے ہیں۔ ان میں سے کسی کا دودھ پیتے ہیں، کسی کا گھی کھاتے ہیں، کسی کے ذریعے کھیتی باڑی میں مدد لیتے ہیں۔ پھر ان کے چارے پانی کا ہم خود ہی انتظام بھی کرتے ہیں۔ مگر اس کپکپاتی سردی میں بھی ان حیوانوں کا وجود اور ان کی حرکات وسکنات میرے لیے ایک تماشا سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں لیکن یہ انسان جو نہ تو میرا کوئی رشتہ دار ہے اور نہ ہی میرا ہم مذہب ومسلک ہے، پھر بھی اس کی تکلیف دور ہوتی دیکھ کر محسوس ہوا کہ گویا میری تکلیف دور ہو گئی۔ شاید یہی انسانیت کا درد ہے۔

■

Ghufran Hakim
HN- 24\3 Noor Nagar, Jamia Nagar
New Delhi-110025
Mob.: 8795192533

کے پی سکسینہ

ننھے منے جانوروں کی لائبریری

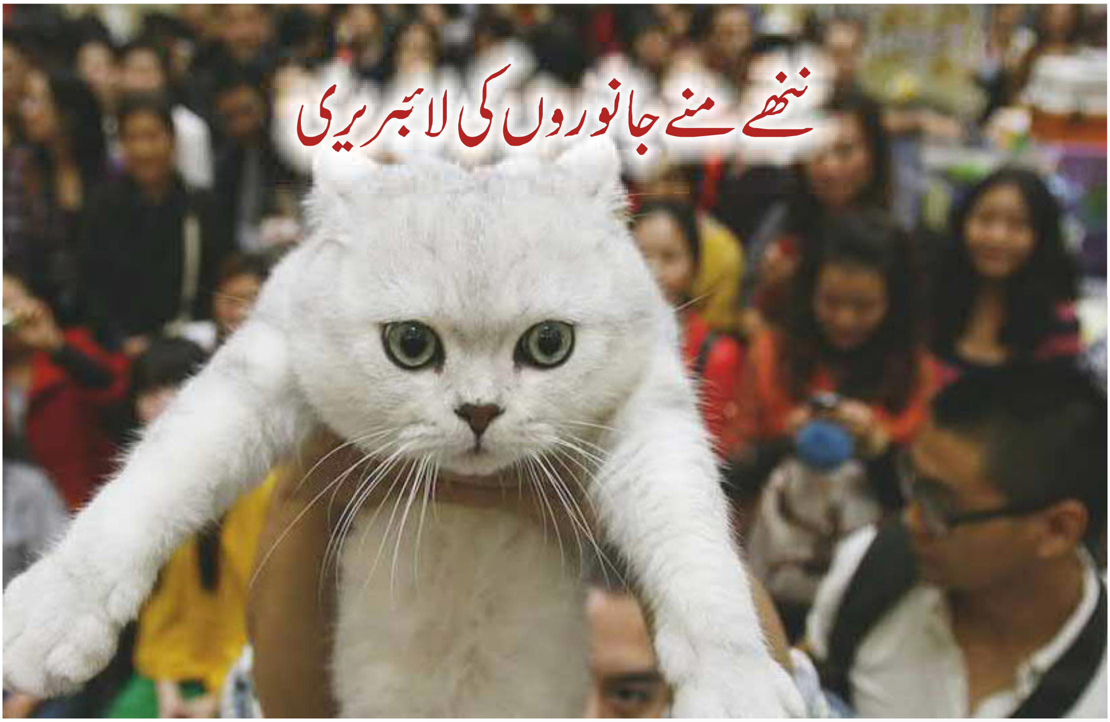

لو اور سنو! ننھے منے جانوروں کی بھی لائبریریاں ہونے لگیں۔عنوان سے کہیں مغالطے میں نہ پڑ جانا۔ جانوروں کی لائبریری سے یہ مطلب نہیں کہ جانور وہاں بیٹھ کر کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہاں جانور پڑھنے نہیں آتے—— بلکہ لائبریری میں رکھے جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے لائبریری میں کتابیں قرینے سے چنی رہتی ہیں۔

جس طرح کسی لائبریری کے ممبر بن کر تم وہاں سے کتابیں پڑھنے کے لیے لے جاسکتے ہو، اسی طرح ان جانوروں کی لائبریری سے اپنا من پسند جانور بھی دل بہلانے کے لیے لے جاسکتے ہو۔ دنیا میں اپنے قسم کی نرالی لائبریری آج سے بارہ سال پہلے جان ریلپے فوربس نام کے ایک شخص نے امریکہ کے سیکرے مینٹو شہر میں کھولی تھی۔ اس سے پیشتر فوربس ایک اسکول میں سائنس پڑھاتے تھے۔ کافی تجربے کے بعد فوربس نے پتہ لگایا کہ جس روز وہ کوئی ننھا منا سا جانور دکھا کر بچوں کو اس کے بارے میں بتاتے ہیں، اس روز بچے اپنے سائنس کے سبق میں بے حد دلچسپی لیتے ہیں۔ یہ بات ان کے دماغ میں گھر کر گئی اور اس سلسلے میں فوربس نے اپنے دو دوستوں کی مدد سے 1952 میں جانوروں کی لائبریری کی بنیاد رکھی۔ لائبریری کھلنے پر پہلے ہی روز کئی ہزار بچے اس کے ممبر بن گئے۔ لائبریری دن دو دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے اور اب تک جناب فوربس اس سے تیرہ لاکھ روپے کما چکے ہیں۔

فوربس کی لائبریری میں مور، کبوتر، طوطے، بلبل، مینا، سفید چوہے، خرگوش، گنی پگ، سمور دار بڑی گلہریاں، ساہی، بلیاں، لومڑیاں اور غیر زہریلے سانپ وغیرہ رکھے ہیں۔

کتابی لائبریری کی طرح جانوروں کی لائبریری کے بھی کچھ مخصوص قاعدے قوانین ہیں۔ سات سال سے زیادہ عمر کے بچے ہی اس لائبریری کے ممبر بن سکتے ہیں۔ کوئی بھی ممبر زیادہ سے زیادہ سات روز تک اپنے پاس جانور رکھ سکتا ہے۔

اس کے بعد جانور واپس نہ کرنے پر ممبر کو تقریباً آٹھ آنے فی روز بطور جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے۔

بچوں کو اس بات کی پوری آزادی ہے کہ وہ چاہے جتنی دیر لائبریری میں جانوروں کے ساتھ کھیلتے رہیں۔ آدھے پون گھنٹے بعد وہ اپنی پسند کا جانور لائبریری میں درج کرا کر لے جاسکتے ہیں۔ سب سے پہلے لائبریری کے کلرک کے پاس جانور کا نمبر لکھوانا پڑتا ہے۔ اسی کے ہمراہ ایک قسم کا فارم بھی بھرنا پڑتا ہے جس کا مضمون اس طرح ہے:

''میں سات سال کا ہوچکا ہوں، جس جانور کو میں لے جارہا ہوں اس کی خوراک، رہن سہن، طور واطوار سے اچھی طرح واقف ہوں۔''

لائبریری کی طرف سے ہر جانور کے ساتھ ایک چھوٹی سی رنگین کتاب بھی دی جاتی ہے جس میں اس جانور کے متعلق ساری معلومات درج رہتی ہیں۔ اس کتاب کو پڑھ کر ممبر، جانور کی اچھی طرح دیکھ بھال کرسکتا ہے۔

ایک ہفتے کسی ممبر کے گھر رہ چکنے کے بعد ہر جانور ڈاکٹری معائنے کے لیے تین روز تک لائبریری کے خاص 'وارڈ' میں رکھا جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ممبر نے جانور کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا اسے بھوکا رکھا۔ بات بالکل برعکس ہے۔ اکثر بچے لاڈ پیار میں جانور کو اتنا کھلا پلا دیتے ہیں کہ جانور کے بیمار پڑنے کا اندیشہ بنا رہتا ہے۔ جانوروں کی دیکھ بھال کے لیے لائبریری میں کئی ماہر ڈاکٹر مقرر ہیں۔ کوئی بھی جانور ممبر کے سپرد کرنے سے قبل اس کی پوری طرح جانچ کرلی جاتی ہے۔ خاص طور پر اس بات کا کافی خیال رکھا جاتا ہے کہ کہیں جانور کو کوئی ایسی چھوت کی بیماری تو نہیں ہے جس کی وجہ سے بچہ ممبر بھی بیمار پڑ جائے۔ سانپ لے جانے کے لیے ممبر کے والدین کو بھی دستخط کرنے پڑتے ہیں۔ ساہی، لومڑی وغیرہ پنجرے سمیت دی جاتی ہیں۔

لائبریری کا ممبر بچہ ہر ساتویں دن اپنی مرضی کے مطابق جانور بدل سکتا ہے۔

ہر بچہ اگر جانور پالنے میں ایسی ہی دلچسپی لینے لگے، تو کوئی مشکل نہیں کہ ہمارے ملک میں بھی بڑے بڑے شہروں میں ایسی ہی لائبریریاں کھل جائیں۔

■

ماخذ: ماہنامہ 'کھلونا' نئی دہلی، **نگراں:** یوسف دہلوی
مدیران: یونس دہلوی، ادریس دہلوی، الیاس دہلوی، اگست 1964

حقانی القاسمی

بچوں کی زمین سے

مہاراشٹر کو اگر ادب اطفال کا گہوارہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو کہ وہاں کے بیشتر اساتذہ اور ادبا کا بچوں کے ذہن اور زمین سے بہت گہرا رشتہ ہے۔ وہاں کے قلمکار ننھے منے بچوں کی ذہنی اور فکری بنیادوں کو مضبوط کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ ان کے جذبات اور ذہن کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے نظمیں، افسانے اور ڈرامے وغیرہ لکھتے ہیں۔

محمد اسداللہ بھی انھی ادیبوں میں شامل ہیں جنھوں نے اپنی ذہنی اور فکری توانائی کا ایک بڑا حصہ بچوں کے لیے وقف کیا ہوا ہے۔ وہ بچوں کے لیے نظمیں، کہانیاں، مضامین، ڈرامے وغیرہ تحریر کرتے رہے ہیں۔ بچوں کے لیے ان کے تازہ شعری مجموعے کا نام ہے 'بچوں کی زمین سے'، جس میں انھوں نے مختلف موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔ اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں زمین بھی بچوں کی ہے اور زبان بھی بچوں کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان نظموں میں بچوں کے لیے کشش بھی ہے اور ان کے لیے بہترین ذہنی غذا بھی۔ محمد اسداللہ نے اس کتاب میں اُن موضوعات کا انتخاب کیا ہے جو آج کے زمانے سے ہم آہنگ ہیں اور بچوں کی ضروریات میں شامل ہیں یا جن سے بچوں کا سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ ان کی ایک نظم ہے 'اکا بکا تین تڑکا'۔ یہ ایسی نظم ہے جو بچوں کے کانوں کو بھلی لگتی ہے۔ اس نظم کا ایک ٹکڑا دیکھیے۔

اکا بکا تین تڑکا — اکا بکا تین تڑکا
پڑھا نہیں تو پھر کیا لکھا — تیر نہیں تھا چلا ہے تکا
آخر میں سب ہکا بکا — رک گئی گاڑی پنکچر چکا
اکا بکا تین تڑکا

اس نظم میں جو موسیقیت اور غنائیت ہے وہ بچوں کو بہت پسند آتی ہے۔ اسی طرح انھوں نے 'جان پہچان' کے عنوان سے ایک ڈرامائی نظم تحریر کی ہے جس میں جہاز، کشتی، موبائل، کار، کلکولیٹر، کتاب، سیب، مچھر اور شیر کردار ہیں۔ یہ اس اعتبار سے بھی ایک اچھی نظم ہے کہ اس کے ذریعے بچوں کو ان تمام چیزوں کے کردار اور کیفیات کا علم ہوتا ہے۔ موبائل کہتا ہے۔

جس سے بھی جی چاہے مِل — کھول رکھ دے اپنا دل
میٹھی میٹھی باتیں کر — چاہے کر دانتا کِل کِل
بات کرے تو آئے بل — میں ہوں مسٹر، موبائیل

تو کلکولیٹر اپنا تعارف یوں کراتا ہے۔

جتنا گننا چاہو تم — میں بتلاؤں فر فر فر
گاگر جیسا چھوٹا ہوں — میں ہوں گنتی کا ساگر
میتھس بھرا میرے اندر — میں ہوں جی کیلکولیٹر

اسی طرح اس میں جہاز، کشتی، موٹر کار، کتاب، سیب، مچھر، شیر، فٹ بال وغیرہ اپنا شعری تعارف کرتے ہیں۔

کتاب میں شامل نظموں کے ذریعے محمد اسداللہ نے بچوں کو پرندوں اور موسموں وغیرہ سے بھی متعارف کرایا ہے۔ اس میں کنگارو بھی ہے، کتے بھی ہیں اور پرندے بھی۔ گرمی بھی ہے، بارش بھی ہے اور نیا سال بھی۔ بچوں کے ذہن اور جذبے سے جڑے ہوئے بہت سارے موضوعات کو انھوں نے نظمیہ پیکر عطا کیا ہے۔ مدرسہ، سورج، چاند ستارے، موبائیل، کتاب،

اسکول، اسکول بس، کرسی یہ وہ چیزیں ہیں جن سے بچوں کو بڑی دلچسپی ہوتی ہے اوران میں سے بیشتر چیزوں سے بچوں کا شب وروز کا رشتہ بھی ہوتا ہے،توان چیزوں کے حوالے سے جونظمیں محمد اسداللہ نے لکھی ہیں ان سے بچوں کی معلومات میں نہ صرف اضافہ ہوتا ہے بلکہ ان کے حصے میں بہت سے نئے الفاظ بھی آتے ہیں اورانہی لفظوں کے ذریعے بچے اپنے جذبات واحساسات کا اظہار بھی کرپاتے ہیں۔

محمد اسداللہ کی نظموں میں انداز ناصحانہ اور واعظانہ تونہیں ہاں ان کی نظموں میں تحریک، ترغیب اورتشویق کے عناصر ضرور ہیں۔ 'چلیے جی اسکول' ایک ایسی ہی نظم ہے جس میں انھوں نے علم کی اہمیت، افادیت اورمعنویت بتاتے ہوئے بچوں کواسکول جانے کے لیے یوں راغب کرتے ہیں۔

چلیے جی اسکول کو چلیے، چلیے جی اسکول
اس دنیا میں جاہل رہنا سب سے بڑی ہے بھول
دنیا کا ہر راز سمجھ میں اسی فضا میں آئے
علم کے موتی انسانوں نے اسی جگہ سے پائے
جو کچھ یہاں سے بن کر نکلے دنیا پر چھا جائے
علم وادب کے اسی چمن میں کھلے ہوئے ہیں پھول
چلیے جی اسکول کو چلیے، چلیے جی اسکول

محمد اسداللہ نے اس کتاب کا نام 'بچوں کی زمین سے' رکھا ہے۔ اس عنوان میں بڑی معنویت ہے کیونکہ بچوں کی زمین اتنی خوبصورت اور پیاری ہوتی ہے کہ جیسے جنت ہو، جہاں حسین وادیاں ہوں، جہاں امن وامان ہو، جہاں محبت ہی محبت ہو، نفرت کا کوئی گزر نہ ہو۔ دراصل یہی وہ زمین ہے جوسب سے حسین ہے، جوسب کی تمنا اورسب کا خواب ہے۔ دیکھیے کتنی خوبصورتی کے ساتھ محمد اسداللہ نے بچوں کی زمین کی خوبصورت تعبیر پیش کی ہے۔

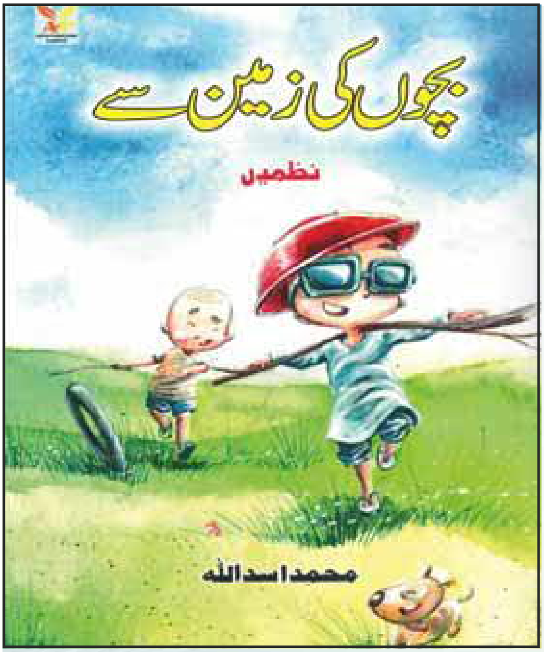

بچوں کی زمین سے مصنف: محمد اسداللہ، **صفحات:** 80، **قیمت:** 50، **سنہ اشاعت:** 2022، **ناشر:** الفاظ پبلی کیشن، پھٹاناولی کامٹی۔ 441001 ضلع ناگپور (مہاراشٹر)

شفاف دل ہمارے بہتی ندی کے دھارے
جھرنے یہ پیارے پیارے نفرت کہیں نہیں ہے
بچوں کی یہ زمین ہے

دراصل یہ صرف بچوں کی زمین نہیں، بلکہ اس میں بچوں کا معصوم ذہن بھی ہے۔ وہی ننھا پیارا ذہن جس میں دنیا کی ساری خوبصورتیاں بھری ہوئی ہیں۔ ہمارے ادب اطفال سے جڑے ہوئے لوگ بھی ایسے ہی ذہن اور زمین کو تیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ یہ کائنات ارضی بچوں کے ذہن ہی کی طرح خوبصورت اور حسین نظر آئے۔

■

Haqqani Al-Qasmi
B-145/8, 4th Floor, Shaheen Bagh
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025
Mob.:9891726444

محمود اختر جلالپوری

کینسر: ایک موذی مرض

ایک نیا طریقہ پودوں کی ہم آہنگی سے نکالا گیا ہے۔ اس تحقیق کے ذریعے کینسر کو جسم کے اندر ہی ختم کر دیا جائے گا۔ ہم آہنگی کا ایک ہارمون پودے کو بڑھنے سے روک دیتا ہے۔ برطانیہ کے محققوں نے اس کا نام انڈول Indol رکھا ہے۔ تحقیق کرنے والوں کا کہنا ہے کہ انڈول الیٹیک ایسڈ (I.A.A) سے پودوں کی جڑیں بڑھنے نہیں پاتیں۔ چنانچہ اس فارمولے کے تحت کینسر کے سیل فنا کیے جاسکتے ہیں۔ ہارمون جو زیادہ تر پودے پیدا کرتے ہیں، انسان کے لیے نقصان دہ نہیں ہوتے ہیں۔ لیبو ریٹری میں تجربہ کر کے سائنس دانوں نے اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کا استعمال ایک انزائم میں ملا کر کیا جو جسم میں پہنچایا گیا۔ اس کے اثر سے کینسر کا ٹیومر ختم ہو گیا اور صحت مند سیل کو کوئی نقصان نہیں پہنچا، صرف ہارمون کے ٹکڑے ٹیومر میں داخل ہوئے۔ یہ بات پروفیسر پیٹر وارڈ مین نے اخباری نمائندوں کو بتائی۔ یہ دوا اڈول الیٹیک ایسڈ کی بنیاد پر تیار کی گئی ہے جو بہت اثر دار ثابت ہوئی۔ کینسر سیل تباہ ہو گئے اور کسی طرح کی اور خرابی پیدا نہیں ہوئی مثلاً بالوں کا جھڑنا، متلی اور قے ہونا وغیرہ جیسی دوسری خرابیاں دوسری دواؤں کے استعمال سے عام طور پر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک تجربہ ریسرچ فاؤنڈیشن کے جے اسپتال چنئی میں کیا گیا جارہا ہے۔ اس کے ذریعے کینسر کے ٹیومر سے مواد حاصل کر کے ایک ویکسین تیار کی گئی ہے۔

اسپتال کے ڈائرکٹر ڈاکٹر جگاولین 25 برسوں سے ایسے ٹیکے تیار کرتے ہیں اور مریضوں پر آزماتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ حال ہی میں ایک 32 سالہ شادی شدہ خاتون جن کا نام سگونہ ہے اور ان کا کینسر چوتھے اسٹیج پر تھا جسے Non Hodking Lymphoma کہا جاتا ہے۔ ان کا غیر مشروط طریقے سے علاج کیا گیا اور وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو گئیں اور پچھلے دو برسوں سے بالکل صحت مند ہیں۔ انھیں یہ ٹیکہ کچھ کچھ وقفے کے بعد اب بھی احتیاطاً لگایا جاتا ہے۔ دو اور آخری منزلوں کے مریضوں کو جو اس اسپتال میں زیر علاج ہیں اور جنھیں سوڈو

پیری ٹونی (Pseudo Peretoni) کینسر کا مرض ہے۔ اس طرح کے ٹیکے لگائے جارہے ہیں اور ان ٹیکوں کی افادیت ثابت ہوچکی ہے۔ ریڈیئیسن اور صفائی کے بعد انھیں ایسے ٹیکے لگائے جاتے ہیں اور اس سے ان کا مرض رکا ہوا ہے۔ محض 05ML. کا ٹیکہ کچھ کچھ وقفے کے بعد لگایا جاتا ہے۔ اسے جانوروں پر بھی آزمایا جارہا ہے۔ مریض چوہوں کے ٹیومر سے مواد لے کر ٹیکہ لگایا جانا اور سنکائی آزمائی جارہی ہے جس سے انھیں مکمل فائدہ پہنچ رہا ہے اور ان کے بچوں میں اس مرض کے آثار نمایاں نہیں ہوئے۔ اس سلسلے میں مزید تحقیق جاری رہنا چاہیے تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ جسم کے بگڑے جین سے مختلف طرح کا کینسر کیسے پیدا ہوتا ہے۔ اصول مرتب کرنے والی ایک کمیٹی قائم کردی گئی ہے جو تجربے اور علاج کرے گی۔ ایک مرتبہ یہ طریقہ مکمل طور پر آزمائش میں پورا اترنے لگے تو اس جان لیوا بیماری سے جو یقینی طور پر موت ہی لاتی ہے، انسانیت کو نجات مل سکتی ہے۔ چھاتی کا کینسر خاص طور پر عورتوں میں دوسری سب سے عام بیماری ہوتی جارہی ہے۔ خاص طور پر یہ ترقی پذیر ممالک میں عام ہوگئی ہے۔ شاید بلکہ زیادہ امکانی وجہ اس کی یہ ہے کہ انسانی رہن سہن اب دیہات کے بجائے زیادہ تر شہری ہوتا جارہا ہے۔ بریسٹ کینسر فاؤنڈیشن کے صدر وی سانیال کا کہنا ہے کہ چھاتی کا کینسر بہت تیزی سے بدل بھی رہا ہے۔ انڈین کونسل آف میڈیکل ریسرچ کی رپورٹ بتاتی ہے کہ چھاتی کا کینسر گلے کے کینسر کے مقابلے دہلی، ممبئی اور ان کے نزدیکی علاقوں میں بڑھ رہا ہے۔ کولکاتا میں کینسر پر تحقیق کرنے والوں نے بہرحال اس سلسلے میں سب سے پہلے لمبی چھلانگ لگائی ہے۔ انھوں نے ایک ایسی دوا ایجاد کی ہے جو محض کینسر کے سیل پر ہی حملہ کرتی ہے جب کہ دوسرے تندرست سیل اس کے اثر سے بالکل محفوظ

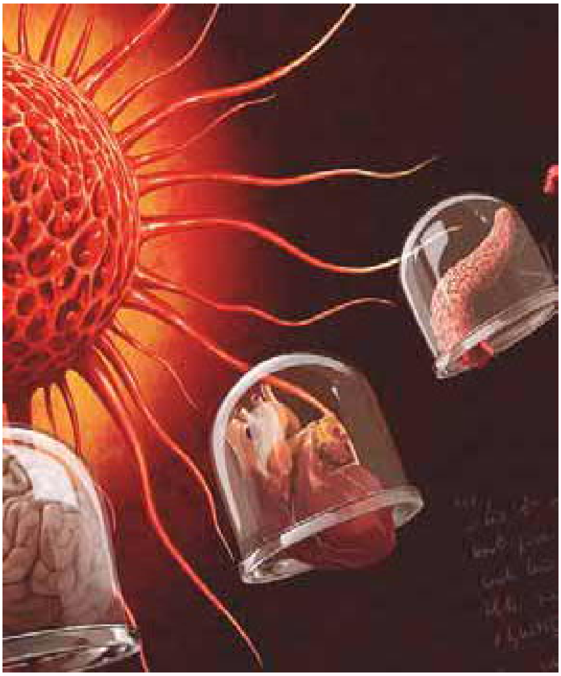

رہتے ہیں۔ اگرچہ امریکہ کے ماہرین کینسر پر اپنی بنائی ہوئی دوا گلائیوک کو 28 مئی 2001 کے ٹائمس میگزین میں مشتہر کراچکے ہیں لیکن کولکاتا کے محقق بغیر کسی تشہیر کے اپنی دس سال سے زیادہ محنت سے تیار کی گئی دوا کے تجربات کا نچوڑ پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی بنائی دوا کے عملی تجربات کو ہی اپنی دستاویز میں شائع کرایا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ دوا ہر طرح کے کینسر کا علاج کرتی ہے۔ جب کہ امریکہ والوں کی دوا محض مائیولائیڈ لیوکیا (Myeloid-Leukema) کا ہی علاج کرتی ہے۔ یہ دوا چھ ماہ تک دی گئی اور اس کی مقدار میں آہستہ آہستہ کمی کی جاتی رہی۔ یہ دوا بیمار کے فی کلو جسمانی وزن کی محض 25 ملی گرام کے حساب سے دی جاتی رہی جسے آہستہ آہستہ گھٹایا جاتا رہا۔

■

Mahmood Akhtar Jalalpuri
Qazi Pura, Jalalpur
Ambedkar Nagar- 224149 (UP)

صحت کا خزانہ: گاجر

نشاط اختر

قدرت نے ہمیں اپنے لازوال خزانے سے کئی متناسب اور مزیدار تحائف سے نوازا ہے اور غذائیت سے بھرپور ایسے پھل اور سبزیاں عنایت کی ہیں جن سے ہمارے جسم کو ضروری توانائی ملتی ہے۔ ہمارے جسمانی و ذہنی نشوونما میں پھل اور سبزیوں کا اہم کردار ہوتا ہے۔ یہ پھل، سبزیاں اَن گنت خوبیوں سے مالا مال ہوتی ہیں، جو ہمارے جسم اور ذہن کے گوشے گوشے کو اپنی لاتعداد صفات سے فائدہ پہنچاتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان خوبیوں کو جانیں اور انھیں استعمال کر کے بھرپور فائدہ حاصل کریں۔

موسم سرما کی آمد ہوتے ہی سبزی بازاروں میں ایک خاص قسم کی ہریالی نظر آنے لگتی ہے۔ ان ہری سبزیوں کے بیچ ہی لال اور گلابی رنگ میں جو سبزی دکھائی دیتی ہے وہ ہے ’گاجر‘

گاجر کو ہندی اور اردو زبان میں یکساں طور پر گاجر ہی کہا جاتا ہے۔ انگریزی میں اسے کیروٹ (Carrot) کے نام سے جانتے ہیں اور اس کا سائنسی نام ’ڈاکس کیروٹا‘ (Daucus Carota) ہے۔

گاجر ہندوستان کی مخصوص جڑ والی فصل ہے جو کہ ’امبیلی فرائی فیلی‘ سے تعلق رکھتی ہے۔ پیداوار کی مناسبت سے چین دنیا کا ایسا ملک ہے جہاں سب سے زیادہ گاجر کی پیداوار ہوتی ہے۔ اسی طرح ہندوستان کے کئی صوبے ہیں جن میں ہریانہ، آندھرا پردیش، کرناٹک، پنجاب اور اتر پردیش کو گاجر کی اپج کے لیے خاص طور سے جانا جاتا ہے۔ ان ریاستوں میں جو

گاجر اُگتی ہے وہ لال رنگ کی اور گہرے ہرے پتوں والی قسم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لگ بھگ 1100 سال پہلے وسط ایشیا، افغانستان، ایران اور ازبکستان میں گاجر کی پہچان جڑ والی سبزی کے طور پر ہوئی تھی۔ جس طرح آلو، پیاز، مولی، ادرک اور اروی جیسی سبزیاں زمین کے اندر سے پیدا ہوتی ہیں ویسے ہی گاجر بھی زمین کے نیچے ہی پیدا ہوتا ہے۔ بناوٹ کے اعتبار سے اس کا بالائی حصہ گول اور نچلا حصہ نوکدار ہوتا ہے۔ اس طرح کی بناوٹ مخروطی Conical کہلاتی ہے۔ کسی بھی پودے میں دو حصے ہوتے ہیں، ایک حصہ زمین کے اوپر ہوتا ہے جسے انگریزی میں شوٹ Shoot کہتے ہیں جس میں شاخیں، پھول، پھل اور پتیاں ہوتی ہیں اور دوسرا حصہ زمین کے نیچے رہتا ہے۔ اس حصہ کو جڑ یعنی Root کہتے ہیں۔ گاجر زمین کے نیچے اُگتا ہے اور اس کا جڑ والا حصہ ہی کھانے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سبزی میں پتلی پتلی دھاگے جیسی سفید رنگ کی جڑیں نکلی ہوتی ہیں جو زمین کو مضبوطی سے پکڑے رہتی ہیں۔ اس کے زمین کا اوپری حصہ پتے دار شکل میں 6 انچ سے 3 فٹ تک کی لمبائی کا ہوتا ہے۔ جب گاجر تیار ہو جاتا ہے تو اس کی کٹائی ہاتھوں سے پودوں کو جڑوں سمیت اکھاڑ کر کی جاتی ہے۔ کٹائی کے بعد گاجروں کے اوپری پتوں کو توڑ کر مٹی لگے گاجروں کو صاف پانی سے دھویا جاتا ہے۔ دیکھنے میں گاجر اور مولی کی بناوٹ ایک ہی جیسی ہوتی ہے۔ صرف رنگ کا فرق ہوتا ہے۔ گاجر کا پودا بونے کے بعد گاجر بننے میں قریب ڈیڑھ سے دو مہینے کا وقت لگ جاتا ہے۔ اس کی اپج کے لیے بلوئی مٹی مناسب ہوتی ہے۔ کاشتکاروں کے مطابق اس کی پیداوار کے لیے سات سے تیئس ڈگری کی درجہ حرارت موزوں ہوتی ہے۔ یوں تو دنیا بھر میں گاجر کی سو سے زیادہ اقسام ہیں لیکن ان میں دیسی گاجر اچھے مانے جاتے ہیں۔ جن کا رنگ لال اور گلابی ہوتا ہے۔ گاجر کی دیسی قسموں کی اپج کے لیے اگست-ستمبر کا وقت صحیح مانا جاتا ہے۔ گاجر نارنجی اور کالے رنگ کا بھی ہوتا ہے اور کچھ گاجر پھیکے رنگ کے ہوتے ہیں۔ گاجر ہر طرح سے کارآمد ہوتا ہے۔ اسے کچا بھی کھایا جاتا ہے اور سلاد بنا کر بھی۔ اس کے علاوہ سبزی، سوپ، کانجی اور اچار، مربہ بنا کر بھی اس کے مختلف ذائقوں کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ کالے گاجر کی کانجی بہت مزیدار ہوتی ہے اس کو پینے سے بھوک بڑھتی ہے۔ گاجر کا نام سنتے ہی دماغ میں مزیدار، ذائقہ دار گاجر کا حلوہ نقش ہو جاتا ہے۔ گاجر کا سب سے زیادہ استعمال حلوہ بنانے میں کیا جاتا ہے۔ جو کھانے میں بہت ہی لذیذ ہوتا ہے جسے بچے اور بوڑھے سبھی مزہ لے کر کھاتے ہیں۔ ہم چاہیں تو گاجر کو فرنچ فرائی کے طور پر بھی کھا سکتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں اس کے ساتھ مٹر اور آلو ملا کر سبزی بھی بنائی جاتی ہے۔ کچھ لوگ تو گاجر کو سکھا کر بھی رکھ لیتے ہیں تا کہ آف سیزن میں دیسی گاجر کو استعمال میں لاسکیں۔

گاجر کے بے شمار فوائد ہیں۔ اس میں پروٹین، روغن، کاربوہائیڈریٹ، کیلشیم، فاسفورس، گندھک اور نشاستہ سبھی کچھ پایا جاتا ہے۔ گاجر میں وٹامن 'اے' بھی کافی مقدار میں ہوتا ہے جو ہماری آنکھوں کی روشنی کے لیے بیحد فائدہ مند ہے۔ بڑھتی عمر کی وجہ سے رتوندھی جسے انگریزی میں Night blindness کہتے ہیں جو اندھے پن کی وجہ بن سکتا ہے گاجر میں موجود کیروٹین سے اس میں آرام ملتا ہے اور رتوندھی کو کم کرنے میں معاون ہے۔ گاجر میں موجود گندھک کا عنصر خون صاف کرنے میں مددگار ہے اور خارش، کھجلی، پھوڑے پھنسی جیسے جلدی امراض میں بھی فائدہ بخش ہے۔ گاجر میں وافر مقدار میں آئرن پایا جاتا ہے اس لیے خون کی کمی کے شکار افراد کو تجویز کیا جاتا ہے۔

اگر چہ گاجر کی تاثیر ٹھنڈی ہوتی ہے پھر بھی یہ سردی میں بہت فائدہ بخش ہے۔ اگر کسی انسان کو سردی زکام کی شکایت ہے تو اسے گاجر کا جوس پینا چاہیے۔ یہ سردی زکام کو چھومنتر کر دیتا ہے اور کمزور ہڈی والے لوگ اگر گاجر کا استعمال کرتے ہیں تو ان کی ہڈیوں سے جڑی بیشتر تکالیف میں آرام ملتا ہے۔ گٹھیا کے مرض میں مبتلا لوگ اگر گاجر کا استعمال کرتے ہیں تو آہستہ آہستہ ان کا یہ مرض ٹھیک ہونے لگتا ہے۔

لاتعداد خوبیوں سے بھرپور گاجر اپنے فوائد کی وجہ کر کئی پھلوں سے بہتر ہے۔ پیٹ کے کیڑے خارج کرنے میں مفید ہے، شوگر کنٹرول کرتا ہے اور کسی حد تک کینسر جیسے مرض کے جوکھم کو کم کرنے میں مدد کرتا ہے۔ گاجر کا جوس پیٹ کے لیے بہت مفید ہے۔ باقاعدہ پینے سے قبض نہیں ہوتا اور خون و گردے کی صفائی قدرتی طور پر ہو جاتی ہے۔ گاجر کو چبا کر کھانے سے دانت اور مسوڑھوں کی ورزش ہو جاتی ہے۔ کھانے کے فوراً بعد کھانے سے منہ کی بدبو، مسوڑھوں کی سوجن اور دانت سے خون نکلنا بھی رک جاتا ہے۔ اگر بچوں کو اس کا باقاعدگی سے استعمال کرایا جائے تو ان کے دانتوں اور ہڈیوں کی صحیح نشوونما ہوتی ہے۔ چھوٹے بچوں کو گاجر کا رس پلانے سے دانت آسانی سے نکلتے ہیں اور دودھ بھی ٹھیک سے ہضم ہوتا ہے۔ اپنی اہمیت و افادیت سے بھرپور گاجر اب تو سالوں بھر بازار میں مل جاتا ہے۔ لیکن وہ دیسی گاجر نہیں ہوتا۔ سالوں بھر ملنے والے گاجر کا رنگ پیلا، نارنجی ہوتا ہے۔ نارنجی گاجر کی کھیتی پہلی بار نیدر لینڈ میں کی گئی تھی۔ جو رنگ اور ذائقہ موسم سرما کے لال گلابی گاجروں میں ہوتا ہے وہ اور کسی موسم میں نہیں ہوتا۔ بلاناغہ گاجر کا استعمال آنکھوں کے امراض، جلد، دانت، دق، پتھری، دبلاپن، ہڈی سے جڑی تکالیف دور کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

گاجر رنگت بھی نکھارتا ہے۔ اس کے باقاعدہ استعمال سے جسم ملائم اور خوبصورت بنتا ہے۔ وزن میں اضافہ اور جسم کی قوت مدافعت بھی بڑھتی ہے۔ اس میں موجود اینٹی آکسی ڈینٹ Anti oxidant اور وٹامن 'اے' سورج کی شعاعوں کے اثرات سے ہمارے جلد کی حفاظت کرتے ہیں۔ جلد پر موجود جھائیاں، جھریاں اور دھبے دور ہوتے ہیں۔ یہی نہیں گاجر کی افادیت کو دیکھتے ہوئے بعض کاسمیٹک کمپنیوں نے کئی قسم کے فیس واش اور اینٹی ایجنگ کریم وغیرہ بھی بنائی ہے جو جلد کی حفاظت میں معاون ثابت ہو رہی ہے۔

ماہرین طب نے بھی اس کے بے شمار فوائد بتائے ہیں۔ گاجر کے اندر قدرتی طور پر 88% پانی کی مقدار پائی جاتی ہے۔ اس لیے اسے کھانے کے بعد فوراً پانی نہیں پینا چاہیے اور کھاتے وقت اس کے اندرونی پیلی گانٹھ کو الگ کر دینا چاہیے کیونکہ اول تو یہ ہضم نہیں ہوتی اور دوسری طرف گاجر کے ذائقہ کو بھی پھیکا کرتی ہے۔ انسانوں کے ساتھ ساتھ یہ خرگوش کی بھی مرغوب غذا ہے۔ سفید خرگوش لال لال گاجر کھاتے ہوئے بڑے خوبصورت نظر آتے ہیں۔

جسمانی و ذہنی نشوونما کے لیے گاجر کا استعمال بے حد ضروری ہے، یہ سستی بھی ہے اور بآسانی فراہم بھی ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہیں کہیں اسے غریبوں کا سیب بھی کہا جاتا ہے۔ موسم کے مناسبت سے اس کا استعمال کسی نہ کسی شکل میں ضرور کرنا چاہیے اور قدرت کے اس تحفے کے لیے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

■

Dr. Nishat Akhtar
C/o Md. Shahid Akhtar (Advocate)
Alamganj Ghere
Near Sarvodya Sainik School Gulzar Bagh
Patna- 800007 (Bihar)
Mob.: 9006503843

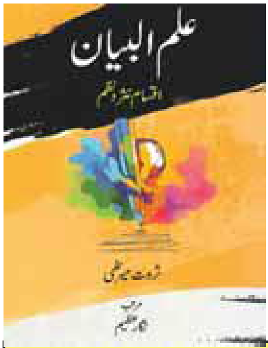

وہ الفاظ جن کے حروف میں نامناسب زیادتی کر کے غلط کر دیا گیا ہے

اردو میں علم بلاغت کے حوالے سے بہت سی کتابیں تحریر کی گئی ہیں جن میں حدائق البلاغت، بحرالفصاحت، تفہیم البلاغت وغیرہ اہم ہیں۔ دراصل یہ کتابیں بچوں اور بڑوں دونوں کے لیے بہت مفید ہیں۔ 'علم البیان : اقسام نثر و نظم' بھی ایک ایسی ہی کتاب ہے جس کے مصنف ثروت میرٹھی نہ صرف معروف شاعر تھے بلکہ ان کے اندر بے پناہ شعر فہمی بھی تھی۔ انھوں نے زبان و بیان کے تعلق سے بہت سے مسائل اور موضوعات کا احاطہ اس کتاب میں کیا ہے جس میں تشبیہ، استعارہ، عیوب کلام، اقسام نثر، اقسام نظم اور دیگر چیزوں کے حوالے سے بہت اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

غلط الفاظ	صحیح الفاظ	کیفیت
الفاظوں	الفاظ	الفاظ خود لفظ کی جمع ہے اس لیے اس کی جمع الفاظوں بنا کر بولنا غلط ہے۔ اردو میں بہت سے الفاظ مثل حوران، جواہرات، سادات، طیور، وجوہات، اخراجات، اسامی، اشرافوں، شائقین
اہل مسلمین	اہل اسلام یا مسلمین	تصاویریں وغیرہ کے رائج ہو گئے ہیں پڑھے لکھے لوگوں کو ان سے احتراز کرنا چاہیے۔ اہل بمعنی 'والا' مسلمین مسلم کی جمع ترکیبی معنی 'مسلمانوں والے' ہوئے مسلمانوں کے لیے یہ لفظ غلط ہے اس کی جگہ صرف مسلمین یا اہل اسلام (اسلام والے) کہنا صحیح ہے۔
اہل ہنود	ہنود	اس کی حالت بھی اہل مسلمین کی سی ہے 'اہل ہند' لفظ صحیح ہے ہندوؤں کے لیے صرف ہنود کہنا درست ہے۔
الخاموشی نیم رضا بے فضول	خاموشی نیم رضا فضول	خاموشی فارسی لفظ ہے اس پر 'ال' لگا کر بولنا غلط ہے۔ فضول کے معنی زائد اور بیکار کے ہیں بے لگانے سے اس کی نفی ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی بے ضرور غلط ہے۔ فضول اور ضرور کے معنوں میں بے فضول اور بے ضرور استعمال نہیں کرنے چاہئیں۔
بمشاہرہ ماہوار پر بے نیل و مرام	بمشاہرہ روپیہ پر بے نیل مرام	بمشاہرہ کے معنی خود ماہوار پر ہیں اس لیے اس لفظ کے ساتھ ماہوار لگا کر استعمال کرنا غلط ہے۔ محروم کے معنی میں مستعمل ہے واو عطف کا غلط ہے کیونکہ نیل بمعنی پانا اور مرام بمعنی مراد ترکیبی معنی ہوئے بغیر مراد پائے یعنی محروم اس لیے بجائے واو عطف اضافت چاہیے۔
پس غیبت پرواہ تازی	غیبت پروا تازہ	غیبت بفتح اول کے معنی ہیں 'پیٹھ پیچھا' اس لفظ سے پہلے پس لگانا بالکل لغو ہے۔ کہتے ہیں حقہ تازی کر، مٹھائی تازی کر۔ اس جگہ تازہ استعمال کرنا چاہیے۔

تاہم بھی	تاہم	ہم کے معنی خود بھی کے ہیں اس لیے بھی بڑھانا غلط ہے۔
تاہنوز	ہنوز	ہنوز کے معنی ہیں 'ابھی تک' اس لیے تا بمعنی لگانا بیکار ہے۔
تابعدار	تابع	تابع عربی اسم فاعل ہے بمعنی مطیع پس اس میں دار لگا کر فارسی ترکیب سے اسم فاعل بنانا غلطی ہے۔
حسب الفرمائش	حسب فرمائش	فرمائش فارسی لفظ ہے اس پر 'ال' عربی لگانا غلط ہے ایسے ہی حسب الفرمود و حسب الفرمان ہیں۔
حقیقتاً میں	حقیقتاً	حقیقتاً کے معنی ہیں حقیقت میں اس لیے اس کے ساتھ میں استعمال کرنا غلط ہے۔
درمیان میں	درمیان	درمیان کے معنی ہیں 'بیچ میں' اس لیے 'اس میں' اور بڑھانا غلط ہے۔
حلوان	حلان یا حلام	حلوان بمعنی بزغالہ غلط ہے اس کی جگہ حلان یا حلام صحیح ہے۔
دونوں فریقین	فریقین یا دونوں فریق	فریقین تثنیہ کا صیغہ ہے اس کے معنی میں دونوں فریق اس لیے دونوں کا لفظ بڑھانا بیکار ہے۔ یہی حالت دونوں طرفین کی ہے اس کی جگہ دنوں طرف یا طرفین کہنا چاہیے۔
دراصل میں	دراصل	اسی طرح درحقیقت میں غلط ہے درحقیقت یا حقیقت میں کہنا چاہیے۔
رنگت	رنگ	'ت' زائد ہے۔
سہولیت	سہولت	بغیر تشدید یا مستعمل ہے جو غلط ہے۔
عیدالضحٰی	عیداضحٰی	عید قرباں کے معنی میں عیدالضحٰی غلط ہے اس کی تشریح کسی دوسری جگہ کردی گئی ہے۔
فرد و بشر	فرد بشر	بغیر واو عطف صحیح ہے۔
فوق البھڑک	بھڑکیلا	بھڑک ہندی لفظ ہے اس پر 'ال' عربی نہیں آنا چاہیے 'ال' عربی الفاظ کے لیے مخصوص ہے۔
قریب المرگ	قریب مرگ	مرگ فارسی لفظ ہے اس پر 'ال' عربی لانا غلطی ہے۔
لِلّٰہ واسطے	لِلّٰہ یا اللہ واسطے	لِلّٰہ میں اول لام کے معنی واسطے کے ہیں اس لیے لِلّٰہ کے ساتھ واسطے لگانا غلط ہے۔
منحوست	نحوست	بعض منحوسیّت کہتے ہیں یہ بھی غلط ہے۔
مختیار	مختار	'ی' درمیانی زائد ہے۔
معرکۃ الارا	معرکہ آرا	آرا فارسی لفظ ہے اس پر 'ال' عربی نہیں لانا چاہیے۔
نخالص	خالص	بے میل اور ملاوٹ کی چیز کو خالص کہتے ہیں 'ن' نفی کا بڑھانے سے اس کے معنی الٹ جائے گا۔
نامکروہ	مکروہ	مکروہ کے معنی ہیں ناپسندیدہ اس لیے اس معنی میں نا بڑھا کر استعمال کرنا بالکل الٹی بات ہے۔ یہ لفظ نخالص کی طرح ہے۔
نامحروم	محروم	اس لفظ کی حالت بھی نامکروہ اور نخالص کی طرح ہے۔ بنا کر استعمال کرنا غلط ہے۔

■

ماخذ: علم البیان: اقسام نثر و نظم، **مصنف**: ثروت میرٹھی، **مرتب**: نگار عظیم، **پہلی اشاعت**: 2021
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

چمن چمن کے پھول

شاعری میں بڑی طاقت ہے۔ اس سے تحریر و تقریر میں تاثیر پیدا ہوتی ہے، خطاب میں زور اور تحریر میں قوت پیدا کرنے کے لیے اشعار کا استعمال بہت کارگر ہوتا ہے۔ پرانے زمانے کے لوگوں کو استاد شعرا کے ہزاروں اشعار یاد ہوا کرتے تھے اور وہ موقع کی مناسبت سے ان اشعار کا استعمال بھی کیا کرتے تھے۔

'چمن چمن کے پھول' میں مختلف رنگ اور شاعروں کے شعر اس لیے دیے جاتے ہیں تاکہ بچے موضوع کی مناسبت سے اچھے اشعار یاد کریں اور اپنی تحریر و تقریر میں اشعار کا موزوں اور برمحل استعمال کرسکیں۔ (ادارہ)

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے
داغ دہلوی

اردو کے چند لفظ ہیں جب سے زبان پر
تہذیب مہرباں ہے مرے خاندان پر
اشوک ساحل

شہد و شکر سے شیریں اردو زباں ہماری
ہوتی ہے جس کے بولے میٹھی زباں ہماری
الطاف حسین حالی

ابھی تہذیب کا نوحہ نہ لکھنا
ابھی کچھ لوگ اردو بولتے ہیں
اختر شاہجہانپوری

اردو ہے جس کا نام ہماری زبان ہے
دنیا کی ہر زبان سے پیاری زبان ہے
دتاتریہ کیفی

بات کرنے کا حسیں طور طریقہ سیکھا
ہم نے اردو کے بہانے سے سلیقہ سیکھا
منیش شکلا

میری گھٹی میں پڑی تھی ہو کے حل اردو زباں
جو بھی میں کہتا گیا حسن بیاں بنتا گیا
فراق گورکھپوری

وہ کرے بات تو ہر لفظ سے خوشبو آئے
ایسی بولی وہی بولے جسے اردو آئے
احمد وصی

وہ عطر دان سا لہجہ مرے بزرگوں کا
رچی بسی ہوئی اردو زبان کی خوشبو
بشیر بدر

ایک ہی پھول سے سب پھولوں کی خوشبو آئے
اور یہ جادو اسے آئے جسے اردو آئے
جاوید صبا

سگی بہنوں کا جو رشتہ ہے اردو اور ہندی میں
کہیں دنیا کی دو زندہ زبانوں میں نہیں ملتا
منور رانا

سلیقے سے ہواؤں میں جو خوشبو گھول سکتے ہیں
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جو اردو بول سکتے ہیں
نامعلوم

جہاں جہاں کوئی اردو زبان بولتا ہے
وہیں وہیں مرا ہندوستان بولتا ہے
منصور عثمانی

وہ اردو کا مسافر ہے یہی پہچان ہے اس کی
جدھر سے بھی گزرتا ہے سلیقہ چھوڑ جاتا ہے
نامعلوم

بچپن نے ہمیں دی ہے یہ شیرینی گفتار
اردو نہیں ہم ماں کی زباں بول رہے ہیں
آذر بارہ بنکوی

ہندی میں اور اردو میں فرق ہے تو اتنا
وہ خواب دیکھتے ہیں ہم دیکھتے ہیں سپنا
نامعلوم

سید محتشم حسان، چہارم، ضلع پریشد اردو اسکول نیم گاؤں، نانڈورہ، مہاراشٹر

تحریم شیخ اقبال، درجہ یازدہم، ملت جونیئر کالج، مہرون، جلگاؤں، مہاراشٹر

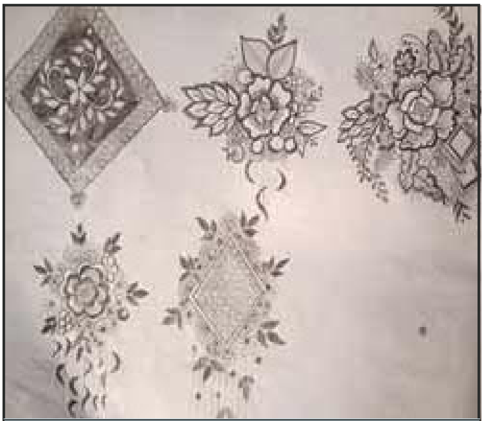

شینا مہوش سید جمال الدین، درجہ دوازدہم
گورنمنٹ اردو گرلز ہائر سیکنڈری اسکول، حریر پورہ، برہانپور، مدھیہ پردیش

صبیحہ بی شیخ شبیر، درجہ یازدہم، گورنمنٹ اردو گرلس ہائر سیکنڈری اسکول، برہانپور، مدھیہ پردیش

تحریم فاطمی رفیق احمد، درجہ دوازدہم، گورنمنٹ اردو گرلز ہائر سیکنڈری اسکول، حریر پورہ، برہانپور، مدھیہ پردیش

غوثیہ بانو عبدالحمید، درجہ دوازدہم، گورنمنٹ اردو گرلز ہائر سیکنڈری اسکول
حریر پورہ، برہانپور، مدھیہ پردیش

عالیہ اقبال، درجہ درجہ چہارم، ہمدرد پبلک اسکول، نئی دہلی

خدیجہ بی شیخ جابر، درجہ ہشتم، ضلع پریشد اردو اسکول ہرتالہ، مکتائی نگر، ضلع جلگاؤں، مہاراشٹر

فرزان احمد مظہر احمد خان، درجہ چہارم
ضلع پریشد اردو اسکول نیم گاؤں، ناندورہ، مہاراشٹر

عطوفہ علی بن علی ظفر، درجہ پنجم، خدیجۃ الکبریٰ گرلس پبلک اسکول، جامعہ نگر، نئی دہلی

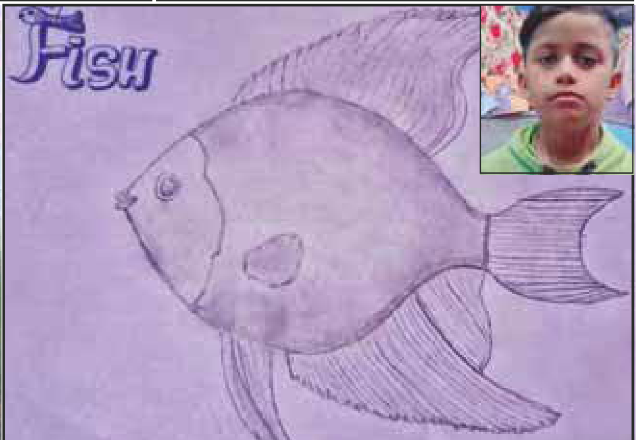

محمد سبحان عظمت علی، درجہ چہارم، فاروق اعظم، انٹر کالج، فیروز آباد، یوپی

ثمرین بانو محمد افتخار، درجہ دہم، گورنمنٹ اردو گرلز ہائر سیکنڈری اسکول
حریر پورہ، برہانپور، مدھیہ پردیش

شیخ حسان محمد علیم، درجہ چہارم، کوٹھڑی پرائمری اسکول نا ندورہ، مہاراشٹر

شاہی عالم، درجہ دوم، دارالہدیٰ اسلامی اکیڈمی، بھیم پور، بربھم ضلع، مغربی بنگال

عبدالمحسن ذیشان، مشیر فاطمہ جامعہ نرسری اسکول، جامعہ نگر، نئی دہلی

ظہور بنت وسیم اختر، درجہ اوّل، جامعہ رحمانیہ، مدن پورہ، وارانسی، یوپی

جویریہ زینب ابن محمد منظر حسین، درجہ اول، مہر منزل، گارڈین ریچ، مٹیابرج، کولکاتا، مغربی بنگال

محمد زید امتیاز خان، درجہ چہارم، این پی اردو، مڈل اسکول، اونار، ضلع بلڈانہ، مہاراشٹر

سمارہ مہوش، درجہ چہارم، سپربھات ہائی اسکول، حیدرآباد، تلنگانہ

شیران ساجد خان، درجہ ہفتم (ب)، ملت جونیئر کالج، مہرون، جلگاؤں، مہاراشٹر

المینہ بانو محمد سرفراز درجہ نہم، گورنمنٹ اردو گرلز ہائر سیکنڈری اسکول، حریرپورہ، برہانپور، مدھیہ پردیش

نوشین انصاری محمد عاقل انصاری، درجہ 12
گورنمنٹ اردو گرلس ہائیر سیکنڈری اسکول حریرپورہ، برہانپور، مدھیہ پردیش

عشرت جہاں سید ریاض، درجہ ہفتم، ضلع پریشد اردو گرلز اسکول، نمبر1، عادل آباد، ضلع جلگاؤں، مہاراشٹر

احمد بن محمد نصیر رمضان، درجہ اوّل، اسلامیہ سینئر سیکنڈری اسکول برانچ نمبر2، مالیرکوٹلہ، پنجاب

قلمکاروں سے چند باتیں

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' ایک مقبول رسالہ ہے جس میں بچوں کے ذہن اور نفسیات کو نظر میں رکھتے ہوئے معلوماتی مضامین، دلچسپ کہانیاں، پیاری پیاری نظمیں اور دیگر مفید تحریریں شائع کی جاتی ہیں۔ اس رسالے میں کوشش کی جاتی ہے کہ پورے ہندوستان کی نمائندگی ہو مگر بسیار کوشش کے باوجود بہت سے علاقوں کی متناسب نمائندگی نہیں ہو پاتی ہے۔ ایسے علاقوں کے ادیبوں کی جستجو ہماری ترجیحی فہرست میں شامل ہے۔

- رسالے میں بچوں کے ادیبوں کے تعارف اور تصویر کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے تا کہ بچوں کے ادیبوں کی ڈائرکٹری ترتیب دینے والوں کو مدد مل سکے۔
- معلومات عامہ، صحت، زبان شناسی، تاریخ، تہذیب، سائنس و ٹیکنالوجی، جغرافیہ، آثار قدیمہ اور اہم شخصیات سے متعلق تخلیقات ترجیحی طور پر شائع کی جائیں گی۔
- 'مستقبل کے قلمکار' عنوان کے تحت بچوں کی تحریروں کو خاص طور پر شائع کیا جائے گا۔
- بچوں کے ادیبوں کے انٹرویوز اور رسائل کے مدیران پر ایک سیریز شروع کی جائے گی۔

قلمکاروں سے گذارش ہے کہ بچوں کی دنیا کے لیے تحریریں بھیجتے وقت درج ذیل امور کا خاص خیال رکھیں:

- بچوں کے لیے صرف وہی تخلیق ارسال کریں جس سے ان کی معلومات اور آگہی میں اضافہ ہو، خاص طور پر وہ تحریریں جو بچوں میں مطالعے کی تحریک اور ترغیب پیدا کریں۔
- تخلیق کی زبان آسان ہو، مشکل الفاظ سے گریز کریں تو بہتر ہوگا۔
- تخلیق غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/ مجلّے میں ارسال نہ کی گئی ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 1200 (بارہ سو) الفاظ سے کم اور 2000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون کے ساتھ اپنا تعارف مع تصویر ارسال فرمائیں۔ تعارف میں بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں اور مضامین کا اندراج ضرور فرمائیں۔
- مضمون میں اعداد و شمار رومن میں لکھیں۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- تخلیق کی اشاعت کے درمیان کم سے کم تین (3) ماہ کا فاصلہ لازمی ہے۔ اس سے کم مدت میں تخلیق کی اشاعت کے لیے اصرار نہ فرمائیں۔
- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کو زیادہ مفید مطلب بنانے کے لیے آپ سب کے مشوروں اور تعاون کی ضرورت ہے۔

—ادارہ

बच्चों की दुनिया मासिक, फरवरी 2023, वर्ष 11, अंक 02
BACHON KI DUNIYA Monthly, February 2023 Vol. 11, Issue: 02
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439/2022-24
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/01/2023
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month
Total Pages: 64

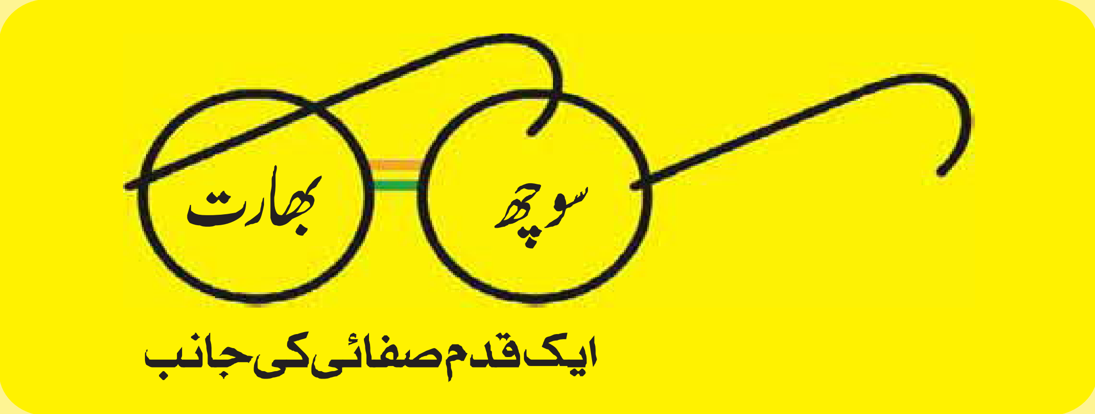

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دل چسپ کتابیں

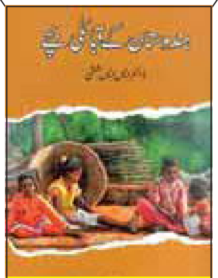
صفحات: 57، قیمت: 20 روپے

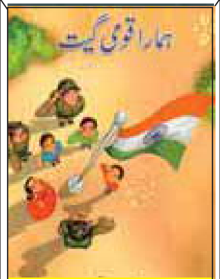

صفحات: 38، قیمت: 20 روپے

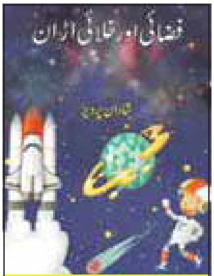

صفحات: 43، قیمت: 15 روپے

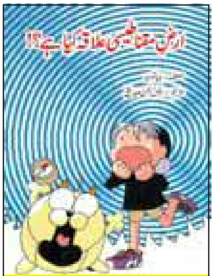
صفحات: 20، قیمت: 20 روپے

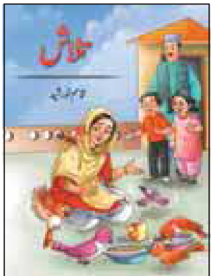

صفحات: 08، قیمت: 15 روپے

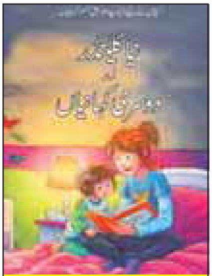
صفحات: 43، قیمت: 15 روپے

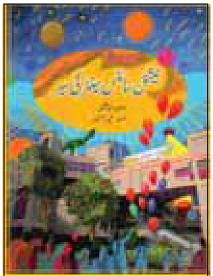
صفحات: 12، قیمت: 15 روپے

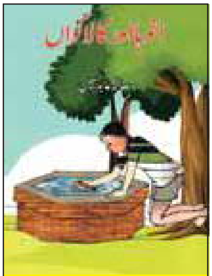
صفحات: 26، قیمت: 15 روپے

خریداری کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S. Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi - 110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6